الله جل جلالہ

خطباتِ فقیر

جلد ستائیس

- محبتِ الٰہی کا انعام
- حفاظتِ قرآن
- احساسِ امانت
- کثرتِ ذکر اور اصلاحِ باطن
- طہارت کے درجات
- ایک مینارہ نور شخصیت
- حسنِ خاتمہ کے اسباب
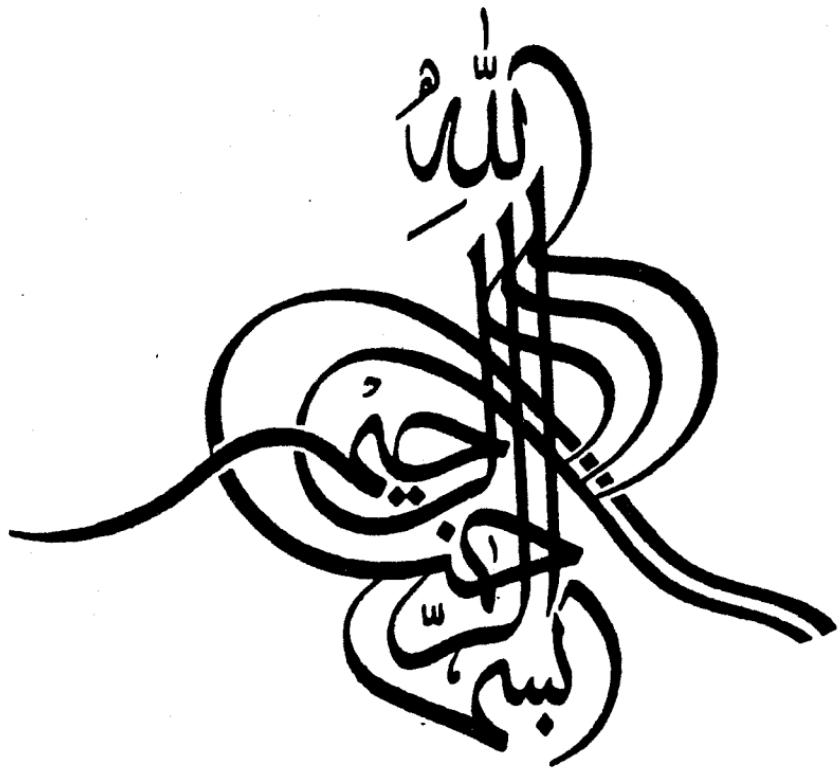
پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، مفکرِ اسلام

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد
+92-041-2618003

خطباتِ فقیر
27
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

بسم الله الرحمن الرحيم

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾

(البقرۃ:۱۶۵)

محبت الٰہی کا انعام

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

اب دنیا میں تو اللہ کو دیکھنا ممکن نہیں مگر مومن کو چین تو نہیں آتا۔ یا اللہ! آپ سے محبت کا تعلق ہے، جی چاہتا ہے کہ آپ کو دیکھیں، آپ سے بات کریں، یہ کیسے ممکن ہوگا؟ اللہ رب العزت نے مومن بندوں کے لیے ایک جگہ تیار فرمائی جس کا نام جنت رکھا۔ حقیقت میں یہ مومن بندے سے ملاقات کرنے کی جگہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ملاقات گاہ ہے بندوں کی۔ اپنے پروردگار سے ملاقات۔ جہاں محبّ اور محبوب کی ملاقات ہو وہ جگہ اچھی لگتی ہے، محبّ کو بھی اچھی لگتی ہے، محبوب کو بھی۔ اس لیے رخصتی ہو کر عورت جس گھر میں آئے، ساری زندگی اسے وہ گھر یاد رہتا ہے۔ کیوں کہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

محبتِ الٰہی کا انعام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ (سورۃ ق: ۳۵)
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم:
((مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ)) (ابن ماجہ، رقم: ۴۲۵۴)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

ہر کلمہ گو کو اللہ سے محبت:

جس شخص نے بھی کلمہ پڑھا اور وہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے دل میں اللہ رب العزت کے ساتھ محبت ضرور ہے، خواہ وہ کسی بھی درجے میں ہو۔ کلمہ پڑھ لینا اللہ رب العزت کے ساتھ محبت کی پکی دلیل ہے۔

محبتِ الٰہی کے درجات:

تاہم محبت الٰہی کے درجات ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں: آپ گرمی میں سفر کر کے گھر آئے تو گھر والی نے آپ کو نل کا پانی بھر کے دے دیا۔ آپ کہتے ہیں: بہت گرم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کو وضو کی ضرورت تھی تو اب آپ کہتے ہیں کہ گرم پانی لاؤ! تو اب پانی کی گرمائش پہلے کی نسبت زیادہ چاہیے ہوگی، اگر وہی نل کا

پانی بھر کے لے آئے تو آپ کہیں گے کہ ٹھنڈا پانی لے کر آ گئی، کیونکہ اب آپ کو گرم پانی چاہیے۔ اور اگر آپ نے چائے پینی ہے اور اس کے لیے پانی منگائیں اور وہ وضو والا پانی لے کر آ جائے تو آپ کہیں گے کہ کیا ٹھنڈا پانی لے کر آ گئی، اب آپ کو ابلتا پانی چاہیے۔ تو تینوں طرح کے پانی کے لیے لفظ تو گرم ہی استعمال ہوا مگر تینوں کی گرمی کا درجہ کچھ اور ہوتا ہے۔

بالکل یہی فرق ہے کہ جس نے کلمہ پڑھا ہے، ہے تو وہ بھی اللہ رب العزت کا چاہنے والا، لیکن اس کے اندر محبت کی حرارت کا درجہ ابھی ذرا کم ہے، اگر وہ نیک اعمال کر کے صالحین میں داخل ہو جائے گا، تو یہ [illegible] اور بڑھ جائے گا اور اگر وہ اولیائے کاملین کے زمرے میں داخل ہو جائے تو یہ پھر ابلتا ہوا پانی بن جائے گا۔ اللہ کی محبت اس کے دل میں ٹھاٹھیں مارتی ہو گی، لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر کلمہ گو بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہوتی ہے۔

فاسق و فاجر کو بھی اللہ سے محبت:

چنانچہ کتنی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی فاسق و فاجر ہے، جا رہا ہے اور نیچے کاغذ کے اوپر اللہ کا نام لکھا ہوا دیکھتا ہے تو رک جاتا ہے اور وہ کاغذ اٹھا کے اپنی جیب میں ڈال دیتا ہے یا اوپر رکھ دیتا ہے۔ یہ تو شراب پیتا تھا، یہ تو فاسق تھا، فاجر تھا، زانی تھا، مگر اس کے دل میں بھی اللہ کی محبت اتنی ہے کہ یہ اس کا نام زمین پر پڑا برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت ہے۔

ایک آدمی کو آپ سمجھتے ہیں کہ جی بہت ہی گناہ گار ہے۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں گالی برداشت کر جائے گا، لیکن اللہ رب العزت کی شان میں ذرا بھی گستاخی برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہ دلیل ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت ہے۔ تو جس نے بھی کلمہ پڑھا اس کے دل میں اللہ رب العزت کی محبت آ گئی۔

سب اللہ کے چاہنے والے:

اب انسان اپنی محنت کے ذریعے سے، اعمالِ صالحہ کے ذریعے سے اس محبت کے درجے کو بڑھاتا ہے، حتیٰ کہ یہ محبت اس کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (سورۃ بقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والوں کو اللہ سے شدید محبت ہوتی ہے''

چنانچہ ہم میں سے ہر بندہ اللہ سے محبت کرنے والا ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب ہی اسیر ہوئے

سب اللہ کے چاہنے والے، اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ دنیا میں جتنا اللہ تعالیٰ سے محبت کی گئی، جتنا اللہ تعالیٰ کو چاہا گیا، جتنا اللہ کے نام پر جانیں فدا کی گئیں، اللہ کے نام پر اپنے مال کو لٹایا گیا، جتنا اللہ کی یاد میں آنسوؤں کو بہایا گیا، جتنا اللہ کو رات کی تنہائیوں میں یاد کیا گیا، اس پوری کائنات میں کوئی دوسری ہستی ایسی موجود نہیں ہے، یہ شان فقط اللہ کی ہے، مخلوق نے اتنا چاہا کہ ٹوٹ کر پیار کیا ؎

نہ دانہ ما گلِ خنداں کہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنِ گفتگوئے تو دارد

''میں نہیں جانتا کہ اس خوبصورت پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو کیا ہے کہ اس باغ کا ہر پرندہ اسی پھول کی گفتگو کر رہا ہے''

محبت کا فطری تقاضا:

جس کو دیکھیے اسی کے دل میں اللہ کی محبت ہے۔ لہٰذا جب کسی کے دل میں محبت

ہوتو اس کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ میں محبوب کو دیکھوں، محبوب سے ملاقات کروں۔
اسی لیے کہنے والے نے کہا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

اسی لیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہہ دیا:

﴿ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ﴾ (سورۃ اعراف: ۱۴۳)

''اے رب کریم! میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں''

مگر بتلا دیا گیا کہ دنیا میں دیکھنا ممکن نہیں۔

مشاہدے کا مقام...... جنت:

اب دنیا میں تو دیکھنا ممکن نہیں مگر مؤمن کو چین تو نہیں آتا۔ یا اللہ! آپ سے محبت کا تعلق ہے، جی چاہتا ہے کہ آپ کو دیکھیں، آپ سے بات کریں، یہ کیسے ممکن ہو گا؟ اللہ رب العزت نے مومن بندوں کے لیے ایک جگہ تیار فرمائی، جس کا نام جنت رکھا۔ حقیقت میں یہ مومن بندے سے ملاقات کرنے کی جگہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ملاقات گاہ ہے بندوں کی۔ اپنے پروردگار سے ملاقات۔ جہاں محبّ اور محبوب کی ملاقات ہو وہ جگہ اچھی لگتی ہے، محبّ کو بھی اچھی لگتی ہے، محبوب کو بھی۔ اس لیے رخصتی ہو کر عورت جس گھر میں آئے، ساری زندگی اسے وہ گھر یاد رہتا ہے۔ کیوں کہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی، اس کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو بھی بندے کی ملاقات گاہ اچھی لگتی ہے، اس لیے اللہ رب العزت قرآن مجید میں طور پہاڑ کی قسم کھائی، کیا فرمایا؟

﴿ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ﴾ (سورۃ یٰسین: ۱-۳)

تو مفسرین نے یہاں ایک نکتہ لکھا کہ اس پہاڑ کی قسم کھانے میں اصل میں یہ بتانا

مقصود تھا کہ میرے بندے! تو جو مجھ سے محبت کرتا ہے، یہ تیری محبت مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ میرے ایک بندے نے مجھ سے ہم کلامی کی، جہاں ہم کلامی کی مجھے وہ جگہ بھی پسند آئی میں نے اس جگہ کی قرآن میں قسم کھا ڈالی۔ دنیا کے لوگ بھی تو نہر والے پل کی باتیں کرتے ہیں، اس لیے کہ ملاقات گاہ ہوتی ہے، اب وہ جنت اللہ رب العزت کے ساتھ ملاقات گاہ کا دوسرا نام ہے۔

ملاقات گاہ کی تیاری:

اب یہ بھی دستور ہے کہ محبّ اور محبوب کی ملاقات جہاں ہو اس جگہ کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ جس گھر میں شادیاں کرواتے ہیں دلہن نے آنا ہو، اس گھر کو سجایا جاتا ہے، صفائیاں کی جاتی ہیں۔۔ اور جس کمرے میں آنا ہو اس کمرے میں تو سیج بچھائی جاتی ہے، اس کمرے کو بہت تیار کیا جاتا ہے، وجہ کیا ہوتی ہے کہ ایک محبّ اور محبوب کی ملاقات ہے یہاں۔

اللہ رب العزت نے بھی بندوں کے ساتھ یہ جو ملاقات گاہ تھی اس کو تیار فرمایا۔ اب کیسا تیار کیا؟ سبحان اللہ دنیا والے تو کم مالدار ہوں تو ذرا کم تیار کیا جاتا ہے، اگر زیادہ مال ہو تو خوب تیار کرتے ہیں اس جگہ کو۔ اللہ رب العزت تو پھر خالقِ کائنات ہیں، فرماتے ہیں: میں نے جنت کو اتنا سجایا:

((مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ))

(المعجم الکبیر، رقم ۵۸۲۷)

’’کسی آنکھ نے اسے دیکھا نہیں، کسی کان نے اس کے بارے میں سنا نہیں اور کسی بندے کے دل پر اس کا خیال تک نہیں گزرا‘‘

تمہارے وہم و خیال اور تصور سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے، اللہ اکبر! میرے بندو! تم جب میری ملاقات کو آؤ گے تم دیکھو گے میں نے تمہارے لیے کیا تیار کیا ہے!

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (سورۃ سجدۃ:۱۷)

''کوئی نہیں جانتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چھپا کر رکھا گیا ہے، ان کے اعمال کے بدلے''

تو اللہ رب العزت سے ملاقات کی جگہ کا نام جنت ہے۔

ملاقات کی دعوت:

اب عام دستور ہے کہ جب ملاقات ہو تو دعوت دی جاتی ہے تو کیا مومن کو دعوت ملی کہ آؤ میری ملاقات کے لیے؟ جی ہاں اللہ رب العزت نے مؤمن کو دعوت دی۔ کیا فرمایا؟ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (سورۃ یونس:۲۵)

''اللہ آپ کو سلامتی والے گھر کی طرف بلاتا ہے''

ملاقات کی تیاری:

اب مومن یہ کہتا ہے کہ یا اللہ! میں اس جگہ پر حاضر تو ہونا چاہتا ہوں لیکن وہاں حاضری کے میں قابل کیسے بن جاؤں کہ وہاں پہنچ سکوں، میں اس کیلئے Qualify (اہلیت) کیسے کرلوں؟ تو ربِ کریم نے یہ بھی بتا دیا، چنانچہ قرآن میں بتا دیا، ارشاد فرمایا: اے میرے بندو!

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ﴾ (سورۃ الکھف:۱۱۰)

''تم میں سے جو امید رکھتا ہے، تمنا رکھتا ہے، اپنے رب سے ملاقات کی'' اسے کیا کرنا چاہیے؟

﴿فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا﴾ (سورۃ الکھف:۱۱۰)

''اس کو چاہیے کہ نیک عمل کرے''

﴿وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (سورۃ الکہف:۱۱۰)

رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ کیا مطلب؟ کہ اب تم ماسوا سے محبت کا تعلق مت جوڑنا، اگر اللہ سے محبت کا تم دعویٰ کر رہے ہو تو نیک اعمال بھی کر کے دکھانا اور ہمارے غیر سے تعلق مت جوڑنا ورنہ کبھی بھی وہاں نہیں پہنچ سکو گے۔

لٰہذا مومن کو چاہیے کہ اپنے دل کو ماسوا سے خالی کر لے اور اپنے جسم کو نیک اعمال کرنے میں کھپا دے۔ نیک اعمال کر کر کے تھکیں اور تھک کر پھر نیک اعمال کریں۔ ہر وقت یہ اللہ رب العزت سے ملاقات کی تیاری میں لگا رہے۔ جیسے کہ کسی تقریب میں جانا ہو تو ہر بندے کا جی چاہتا کہ اگلی کرسی پر مجھے جگہ ملے۔ تو جنت میں اگلی کرسی سے مراد اوپر کا درجہ ہے، اس اوپر کے درجے کو پانے کے لیے پھر محنت بھی زیادہ کرنی پڑے گی، اعمال بھی زیادہ کرنے پڑیں گے۔

جنت کا سیکورٹی گیٹ:

عام طور پر دیکھا ہے کہ تقریب میں جب لوگ آتے ہیں نا تو ایک سیکیورٹی ہوتی ہے جہاں سے ان کو گزر کے آنا پڑتا ہے۔ ہوائی جہاز کے اڈوں پر آپ دیکھیں مشینیں لگی ہوتی ہیں، اس سے گزر کے جانا پڑتا ہے، اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون بندہ ایسا ہے کہ اس کے پاس کوئی غلط چیز ہے۔ اللہ رب العزت نے بھی جنت کے راستے میں ایک ایسی جگہ کو بنا دیا جس کو پل صراط کہتے ہیں فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

(مریم:۷۱)

''یہ حتمی اور فیصلہ شدہ بات ہے کہ تم میں سے ہر بندہ اس سے گزرے گا''

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا﴾ (مریم:۷۲)

''پھر ہم نجات دیں گے ان کو جو متقی ہوں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے''

جنت کا استقبالیہ:

اب اس میں سے بھی ایک مومن پاس ہو گیا، اب جب پاس ہو گیا تو عام طور پر دیکھا کہ لوگ تقریب کی جگہ پر استقبال کے لیے لوگوں کو کھڑا کرتے ہیں کہ مہمان آئے تو انہیں راستہ دکھانا، ان کو لے کر آنا، تو وہ لوگ مہمان کو دروازے تک لے کر آتے ہیں۔ چنانچہ جنت میں لے جانے کے لیے اللہ کے فرشتے کھڑے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (الزمر:۷۳)

''کہ تم میں سے ہر ابندہ اس سے گزرے گا''

قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ باقاعدہ وفد کی شکل میں جائیں گے جیسے کہ مل کر جاتے ہیں، پروٹوکول مل رہا ہو گا ان کو،

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (مریم:۸۵)

''اس دن متقین کو رحمٰن کے سامنے وفد کی صورت میں جمع کیا جائے گا''

اب جب یہ جنت میں پہنچیں گے تو پھر وہاں پر جو جنت کے فرشتے ہوں گے وہ بھی ان کو سلام کریں گے، جیسے تقریب میں آنے والے لوگوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔ تو استقبال کیسے ہو گا؟ فرمایا:

﴿وَالْمَلٰئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ (الرعد:۲۳-۲۴)

''ہر دروازے سے فرشتے ان کی طرف آئیں گے اور کہیں گے تم پر سلامتی ہو تم نے صبر کیا''

یہ جو ہے نا سَلَامٌ عَلَيْكُم، لفظی مطلب تو یہی ہے کہ تم پر سلامتی ہو لیکن اگر اپنی زبان میں ہم اس کا مفہوم سمجھنا چاہیں تو اس کا مفہوم ہے سَلَامٌ عَلَيْكُم کہ تمہیں شاباش ہو۔ یہ اس کا معنیٰ ہے، او تمہیں شاباش ہو۔ جب کوئی خوش ہوتا ہے نا کسی سے تو کہتا ہے شاباش! تو فرشتے جو کہہ رہے ہیں سَلَامٌ عَلَيْكُمْ مطلب یہی ہوگا کہ تمہیں شاباش ہو، اور تم جیتے رہو، تم نے صبر کیا۔

﴿ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (الرعد:۲۴)

''دیکھو تمہیں کیسا گھر اللہ نے عطا فرمایا''

جنت کا مہمان خانہ:

چنانچہ متقی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اب اللہ رب العزت نے ان کے لیے وہاں پر بہترین گھر اور ٹھکانہ تیار کر رکھا ہوگا۔ ہم نے دیکھا کہ اگر کوئی آدمی سرکاری مہمان ہوتا ہے تو اس کے لیے ایک گیسٹ ہاؤس بنایا ہوتا ہے۔ جس کو کہتے ہیں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کہ جی یہ اس ملک کا مہمان خانہ ہے۔ تو جنت کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے کہ جنتی جب جائیں گے تو یہ مہمان ہوں گے اور مہمان نوازی کرنے والے اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴾ (حٰم سجدہ:۳۲)

''یہ اس غفور اور رحیم کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی''

جنت میں مہمان نوازی:

اب ہر بندہ چاہتا ہے کہ مہمان کو اس کی طبیعت کے مطابق ہر چیز ملے لیکن پتہ تو نہیں ہوتا کہ اس کی طبیعت کیسی ہے؟ تو اپنی طرف سے میزبان کوشش کرتا ہے مہمان کو اس کی طبیعت کے مطابق چیز بہم پہنچانے کی لیکن کبھی نہیں بھی ملتی۔ تو دنیا کا معاملہ تو

ایسا ہے، مگر اللہ رب العزت کا معاملہ دیکھیے کہ رب کریم نے فرمایا کہ دنیا والو! تم بڑی مہمان نوازیاں کرتے ہو، میں تو مالک الملک ہوں، میری مہمان نوازیوں کا معاملہ دیکھو کہ جب تم آؤ گے تو تمہارے لیے ایسا مہمان خانہ بنایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ﴾ (حمٓ سجدہ:۳۱)

''تمہیں ہر وہ چیز ملے گی جو تمہاری چاہت میں ہوگی''

جو تمہاری خواہش ہوگی تمہیں ملے گا، کیا مہمان نوازی ہوگی اس پروردگار کی! جو انسان چاہے گا اسے ملے گا۔

چنانچہ جنت کے اندر خدام بھی ہوں گے، ارشاد فرمایا:

﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ (الواقعۃ:۱۷)

''اور ان کے گرد لیے پھریں گے ہمیشہ رہنے والے لڑکے''

اتنے خوبصورت ہوں گے!

﴿إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا﴾ (الدھر:۱۹)

''تو دیکھے تو ایسے لگے جیسے بکھرے ہوئے موتی ہوتے ہیں''

اور پھر وہاں پر کھانے پینے کا سب انتظام موجود۔

﴿بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيْقَ وَّكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ﴾ (الواقعۃ:۱۸)

''تو دو کوزے اور آفتابے جام شراب سے بھرے ہوئے''

جنت میں جو دستر خواں لگایا جائے گا، اس کا طریقہ بتا دیا کہ وہ کیسے لگے گا کہ دستر خواں بچھا کر پہلے برتن رکھے جائیں گے بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ یہ برتنوں کا تذکرہ ہے اور واقعی سنت طریقہ بھی یہی ہے دستر خوان لگانے کا کہ دستر خوان بچھاؤ اور پہلے اس پر آکر پلیٹیں گلاس جو رکھنا ہے رکھ دو اور پھر اس کے بعد مشروب لاؤ۔

﴿لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ﴾ (الواقعۃ:۱۸، ۱۹)

''نہ اس سے نہ سر چکرائیں گے نہ وہ بہکیں''

پھر مشروبات رکھو! جب مشروبات رکھ دیے

﴿وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ﴾ (الواقعہ:۲۰)

''اب اس کے اوپر میوے رکھ دو کھانے کے لیے''

جب آگئے ہیں تو اب

﴿وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ﴾ (الواقعہ:۲۱)

''پھر بھنا ہوا گوشت رکھیں گے''

تو ترتیب دیکھو جو دسترخوان کی ہوتی ہے قرآن مجید میں بالکل وہی پہلے سے بتا دی۔ اللہ رب العزت ایسی مہمان نوازی کریں گے کہ جنتی کھائیں گے مگر بھوک کی وجہ سے نہیں، لذت لینے کی خاطر اور دنیا میں کچھ کھا لو تو پیٹ بھر جاتا ہے، جی چاہتا ہے کہ کچھ اور کھائیں مگر کھا نہیں سکتے کوشش کے باوجود جگہ ہی نہیں ہوتی۔ مگر جنت میں ایک خوشبودار ڈکار آئے گی اور انسان پھر کھانا شروع کر دے گا، وہ بھی کیا عجیب جگہ ہوگی؟ سبحان اللہ! تو اللہ رب العزت نے بندے کے لیے ایسی مہربانی فرما دی، دنیا کو اللہ نے کام کی جگہ بنایا، قبر کو اللہ نے آرام کی جگہ بنایا، اور عرش کے نیچے اللہ نے ناشتے کا انتظام فرمایا۔ قیامت کے دن جب لوگ حساب کتاب دے رہے ہوں گے تو مشک کے ٹیلے ہوں گے اور جنتی وہاں مزے کر رہے ہوں گے۔ اور پھر جیسے راستے میں رک کر ماشاء اللہ مشروبات پلاتے ہیں تو حوض کے اوپر اللہ نے مشروبات کا انتظام فرمایا اور جنت کے اندر اللہ نے کھانے کا انتظام فرمایا۔

مہمانوں کے تین درجات:

اچھا جنت میں جائیں گے تو ہر ایک کا اپنا ایک مرتبہ ہوگا۔ آپ دیکھیں کہ مہمان جو آتے ہیں وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ توجہ فرمائیں! ایک تو یہ کہ راستہ گزرتے

لوگ ہوتے ہیں آپ ان کے لیے ٹھنڈے پانی کی ایک ٹوٹی لگا دیتے ہیں کہ جو آئے یہاں سے پانی پی کے چلا جائے۔ سبیل لگی ہوئی ہے ہر ایک کے لیے، جو بھی آئے۔ لیکن کچھ آپ کے دوست ہوتے ہیں، جب وہ آتے ہیں تو آپ خادم کو کہتے ہیں کہ بھئی شربت لے جاؤ اور مہمان کو پلاؤ۔ یہ دوسرا درجہ ہوتا ہے اور تیسرا درجہ یہ کہ کچھ ایسے مہمان ہوتے ہیں جو بہت کلوز ہوتے ہیں، قریب ہوتے ہیں، تو جب وہ گھر میں آتے ہیں تو آپ شربت بنوا کے خود اپنے ہاتھ سے اٹھا کے لے جاتے ہیں اور گلاس بھر کر مہمان کو دیتے ہیں، یہ مہمان کا تیسرا درجہ ہوتا ہے۔

جنت میں بھی اسی طرح کچھ تو ایسے لوگ ہوں گے جن کو وہاں پر پانی پلایا جائے گا۔

﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ (سورۃ مطففین: ۲۸)

''ماشاء اللہ چشمے ہوں گے اس سے وہ آ کے پانی پیا کریں گے''

خود پییں گے تو یہ ایک درجہ کے مہمان ہوئے۔

دوسرے مہمان وہ ہوں گے کہ ان کے لیے وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ خادم ہوں گے۔

وہ ان کو بھر بھر کے جام دیتے پھریں گے۔

تیسرے اللہ کے چاہنے والے، اللہ سے محبت کرنے والے، اللہ سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے۔ یہ ایسے لوگ ہوں گے جب یہ جائیں گے تو اللہ رب العزت خود ان کو شرابِ طہور پلائیں گے۔ سنیے قرآن عظیم الشان اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (سورۃ الدھر: ۲۱-۲۲)

''ان کا رب انہیں پاکیزہ شراب پلائے گا یہ بدلہ ہوگا ان کا اور ان کی محنت کا انعام''

کتنے نصیب والے لوگ ہوں گے کہ جن کی اللہ رب العزت کی طرف سے ایسی مہمان نوازی ہوگی۔

دنیا کے اعمال کا اجر جنت میں کیوں؟

یہاں ایک طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو یہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، نیک اعمال کریں، تو نقد کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب عبادت اب کر رہے ہیں تو اجر بھی تو ابھی ملنا چاہیے۔ بادشاہوں کا دستور تو یہی ہوتا ہے کہ جیسا کام کرو نقد بدلہ پاؤ مگر یہاں تو جنت کا وعدہ کرلیا گیا۔ تو یہ کیا معاملہ ہوا؟ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ ہمارا پروردگار اس بات سے بلند ہے کہ مومن عبادت کے ذریعے نقد کا معاملہ کرے اور اللہ اس کے اجر کو قیامت کے ادھار پر چھوڑ دے۔ بھئی ادھار تو وہ کرتا ہے جو دے نہ سکتا ہو تو یہاں کیوں ادھار کیا گیا؟ وہ تو مالک الملک ہے۔

تو علما نے یہاں ایک وجہ لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ دیکھو کہ اگر مومن کے تمام اعمال پر اللہ تعالیٰ دنیا میں بدلہ دے دیتے تو ایک تو یہ کہ جس طرح دنیا فانی تو وہ ملنے والا اجر بھی فانی ہوتا۔ اور دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اتنا بہترین اجر دینا چاہتے تھے کہ دنیا اس اجر کو اپنے اندر سمونے کے قابل ہی نہیں۔ مثال کے طور پر جس جنتی کو سب سے آخر میں جنت ملے گی اس کا تذکرہ حدیثِ پاک میں ہے کہ وہ کسی طرح گھسٹتا ہوا بالآخر پل صراط سے گزرے گا اور جنت میں لایا جائے گا، اس کو اس زمین اور آسمان کے خلا سے دس گنا بڑی جنت عطا کی جائے گی۔ تو جب اتنی بڑی جنت دی جائے گی تو وہ بندہ کہے گا کہ اللہ میں بندہ، آپ میرے پروردگار، آپ میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کیسے؟ وہ کہے گا اللہ پوری دنیا سے دس گنا بڑی جنت! اس کو یقین نہیں آئے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ہاں ہاں! میں وہ مالک الملک ہوں، جتنا چاہوں جس کو دوں، تجھے دنیا سے دس گنا بڑی جنت عطا

کی۔اب سوچیں جو آخری جنتی کو دس گنا بڑی جنت ملے گی تو پھر صلحا اولیا صحابہ انبیا ان کی جنتوں کا کیا عالم ہوگا؟ تو کیا اتنا سب کچھ دنیا اپنے اندر سما سکتی ہے، سما ہی نہیں سکتی اور پھر ایک ہوتی کوانٹٹی اور ایک ہوتی ہے کوالٹی۔یعنی ایک ہوتی ہے مقدار اور ایک ہوتا ہے معیار۔تو مقدار کو دیکھیں تو بھی دنیا اجر کو نہیں سما سکتی اور معیار کو دیکھیں تب بھی۔سبحان اللہ! جنت کی ایک حور کے بارے میں فرمایا کہ اللہ نے اس کو اتنی خوبصورتی دی کہ اگر مردے سے کلام کر لے تو مردہ زندہ ہو جائے، کھاری پانی میں تھوک ڈال دے تو کھاری پانی میٹھا ہو جائے، اپنے پلو کو اگر آسمان سے نیچے کر دے تو سورج کی روشنی ماند پڑ جائے۔اب بتاؤ! ایک جنت کی مخلوق ہے اس کا یہ درجہ ہے تو کیا دنیا ان نعمتوں کو اپنے اندر سما سکتی ہے۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اے میرے بندے! اگر تجھے میں دنیا میں اجر دے بھی دیتا تو دنیا عارضی اور تیرا وہ اجر بھی عارضی ہوتا اور میں وہ پروردگار ہوں جو تیرے محدود عملوں پر تجھے ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا اجر عطا کرنا چاہتا ہوں۔اس لیے جب تم میرے پاس جنت میں آؤ گے تو پھر تم میری فیاضی کو دیکھو گے کہ میں کتنا عطا کرنے والا ہوں، لہٰذا جنت ہی ایسی جگہ ہے جہاں ہمیشہ رہنے والا اجر دیا جا سکتا ہے۔

جنت کا شوق نہ جہنم کا خوف:

اب عام مومن کے دل میں جنت کا شوق بھی ہوتا ہے اور جہنم کا خوف بھی ہوتا ہے، یہ ایک قدرتی سی بات ہے، جہنم سے ڈرتا ہے اور چاہتا ہے کہ میں جنت میں چلا جاؤں۔لیکن کچھ اولیاء اللہ کے واقعات ایسے ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو نہ تو جنت کی پروا ہوتی تھی اور نہ جہنم کا ڈر ہوتا تھا۔مثال کے طور پر رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا اللہ کی نیک بندی تھیں۔ایک دفعہ ایک ہاتھ میں پانی اور ایک ہاتھ میں آگ لیے چلی جا رہی ہے۔کسی نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہنے لگی کہ بس میرا جی چاہتا ہے کہ آگ سے جنت کو

آگ لگادوں اور پانی کے ذریعے جہنم کی آگ کو بجھادوں۔ اس نے کہا: کیوں؟ اس نے کہا کہ لوگ عبادت کرتے ہیں جنت کی طلب میں یا جہنم کے خوف میں تو میں چاہتی ہوں کہ نہ جنت رہے نہ جہنم رہے۔ بندے اللہ کی عبادت فقط اللہ کی رضا کے لیے کرسکیں۔

ابنِ فارض ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کے بارے میں آتا ہے کہ موت کے وقت ان کو جنت دکھائی گئی تو انہوں نے ادھر سے منہ ہی پھیرلیا اور یوں کہنے لگے:

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَ كُمْ مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

''اے اللہ! اگر تیری محبت میں میرا صرف یہی بدلہ تھا کہ تو بدلے میں جنت دے گا تو میں نے بدلے میں کیا پایا؟ میں نے تو اپنی زندگی کے دن ضائع کر دیے''

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ممشاد بنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے، آخری وقت تھا کسی نے دعا دی کہ اللہ! ممشاد کو جنت کی نعمتیں عطا فرما تو انہوں نے مسکرا کر کہا کہ بیس سال تک جنت میرے سامنے پیش ہوتی رہی میں نے آج تک رب کی طرف سے نظر ہٹا کر جنت کی طرف نہیں دیکھا۔

اب یہ واقعات ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ ایسے اللہ والے تھے کہ جنت کہ طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے اور دوسری طرف جو دیکھتے ہیں تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث مبارکہ کہ ہم کو اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا سکھائی کہ تم رمضان مبارک میں مانگا کرو:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ))

''اے اللہ! میں آپ سے جنت طلب کرتا ہوں''

((وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ))

''اور جہنم کی آگ سے پناہ مانگتا ہوں''

تو حدیث مبارکہ میں یہ دعا سکھائی گئی جبکہ اولیاء اللہ کے حالات وہ ہیں، تو ایک عام سالک کنفیوز ہوتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے اس کے ذہن میں کہ مسئلہ کیا ہے؟ کیا خیال ہے آج اس مسئلے کو ہم سمجھ لیں، اس مسئلے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سالک کا روحانی عروج ونزول:

مسئلہ یوں سمجھیے کہ سالکین کو جب ذکر کرتے ہوئے اللہ کے ہاں روحانی اعتبار سے ترقی ملتی ہے تو ترقی اور ان کی پرواز کے دوران ان کی کیفیات کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ جب وہ ترقی مکمل ہو جاتی ہے تو اس وقت کیفیات مختلف ہوتی ہیں، چنانچہ ایک آدمی کو روحانی ترقی نصیب ہوئی اب اس روحانی ترقی کا نام ہمارے بزرگوں نے عروج رکھا، اس کو فرمایا کیا کہ اس کو عروج نصیب ہوا، روحانی طور پر اس کی روح کو بلندی نصیب ہوئی، پھر ایک وقت آتا ہے، جب وہ اوپر کی جو دنیا ہے جس کو ہم عالمِ امر کہتے ہیں وہاں پہنچ گیا، اس کو بزرگوں نے فنا کہہ دیا اور جب وہاں سے واپس لوٹے تو اس کو انہوں نے نزول کہہ دیا، جب اس دنیا میں واپس آئے اس کو انہوں نے بقا کہہ دیا۔ اس کو سیور اربعہ یعنی چار سیروں کا نام دے دیا۔

(۱) سیر الی اللہ (۲) سیر فی اللہ (۳) سیر من اللہ (۴) سیر فی الاشیاء

اور اسے فنا بقا بھی کہتے ہیں۔ پہلے اس کا عروج شروع ہوا جب وہ اپنی اصل سے غافل ہو گیا تو اس کو فنا مل گئی، جب واپس آیا تو نزول ہوا، اور جب وہ اس دنیا میں پہنچ گیا تو یہ اس کی بقا ہو گئی۔

عروج ونزول پر سالک کی کیفیت:

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب سالک کا عروج اور نزول ہو رہا ہو اور وہ عالمِ امر

میں ہوتو ایسے وقت میں اس کی توجہ خالصتاً اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اسباب سے اس کی نظر اٹھ جاتی ہے۔ لہٰذا اب کیونکہ اس کی کیفیت ایسی کہ اسباب پہ نظر ہی نہیں، لہٰذا اس قسم کے لوگوں سے بہت ساری کرامات صادر ہوتی ہیں۔ کرامت کیا ہے؟ خرقِ عادت ہے، عام معمول سے ہٹ کے کوئی بات ہو جانا، اس کو کرامت کہہ دیتے ہیں، چنانچہ آپ اگر غور کریں تو اس امت کے اولیاء اللہ سے اتنی کرامتیں صادر ہوئیں کہ لکھنا چاہیں تو سینکڑوں جلدیں بن جائیں۔ جب کہ صحابہ کرام کی جماعت سے جو کرامتیں صادر ہوئی وہ شاید دو، چار سو صفحوں میں ہی ختم ہو جائیں۔ یہ فرق کیا ہے؟ بھئی فرق یہ ہے کہ صحابہ کرام کاملین تھے، ان کا عروج ونزول کامل تھا۔ لہٰذا ان کی ظاہری زندگی بالکل ایک عام آدمی کی مانند نظر آتی تھی۔

مبتدی اور منتہی میں فرق:

اب یہاں ایک اصولی بات سمجھیں، جو بہت فائدہ دے گی۔ مبتدی اور منتہی ان کی ظاہری صورت ایک ہوتی ہے۔ مبتدی کہتے ہیں جو ابتدا میں ہو، منتہی کہتے ہیں جو اپنے کام کو انجام تک پہنچا چکا ہو۔ تو مبتدی اور منتہی کا ظاہر ایک ہوتا ہے لیکن ان کے باطن میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ جتنا منتہی اپنے نقطہءکمال تک پہنچے گا اتنا دیکھنے میں وہ بالکل مبتدی کی طرح نظر آئے گا، گو باطن میں بہت زیادہ فرق ہوگا، اس کا باطن کچھ اور ہے اس کا کچھ اور مگر ظاہر بالکل ایک جیسا۔ اب ذرا اس کی مثالیں سن لیجیے:

◉......حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ایک شاگرد ہیں اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وہ ان کے شیخ ہیں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا عروج نزول بالکل مکمل کامل اور حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ابھی راستے کے راہی ہیں۔ چنانچہ کیا ہوا؟ ایک جگہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جانا تھا، راستے میں دریا تھا، آپ وہاں گئے، دیکھا کہ کشتی نہیں آپ انتظار میں بیٹھ گئے کہ کشتی آئے گی تو میں دریا کو عبور

کروں گا۔ پیچھے حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ آ کے کھڑے ہوئے سلام کیا، سلام کرنے بعد کہا کہ اچھا حضرت مجھے تو جلدی جانا ہے، یہ کہا اور پانی کے اوپر چلتے ہوئے گزر گئے۔ اب ظاہر دیکھیں تو شاگرد کامل نظر آتا ہے کہ پانی پر چلا، مگر کامل تو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اس کشتی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وجہ کیا تھی کہ ان کا عروج ونزول مکمل تھا۔ لہٰذا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہر زندگی بالکل اسباب کے تحت تھی اور حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کیونکہ راستے کے راہی تھے، نظر اسباب سے ہٹی ہوئی تھی، اس لیے وہ پانی پر چلتے ہوئے دریا سے گزر گئے۔

◉......اسی طرح کا ایک واقعہ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو پکڑنے کے لیے پولیس آگئی۔ آپ ذرا بھاگے آگے دیکھا کہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کا کمرہ بھی تھا ان کے کمرے میں گھسے اور کہا کہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ میرے بارے میں کسی کو مت بتانا۔ پیچھے سے پولیس آگئی، انہوں نے پوچھا کہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ یہاں کہیں سے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں، کدھر گئے ہیں؟ کہنے لگے: اس کمرے میں۔ اب وہ پولیس کمرے میں گئی تو ان کو کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ وہ باہر نکلے انہوں نے کہا کہ یہ دیوانہ سا آدمی ہے ایسے ہی بات کر رہا ہے، وہ چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ باہر آئے، انہوں نے کہا: حبیب عجمی! میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ تم مت بتانا کہ میں یہاں ہوں، تم نے تو بتا دیا۔ کہنے لگے: جی بتا تو دیا۔ کیا آپ ان کو نظر آگئے؟ میرے اللہ نے آپ پر ان کی نظر پڑنے ہی نہیں دی یعنی اتنی ان کی نظر اللہ پر تھی کہ اسباب درمیان میں سے ہٹ گئے تھے۔

◉......چنانچہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جا رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ حبیب عجمی کی سوئیٹر پڑی ہوئی ہے، کھڑے ہو گئے کہ پتہ نہیں یہ دیوانہ چھوڑ کے کہاں چلا گیا؟ کوئی چوری کر

لے گا کوئی لے جائے گا، تھوڑی دیر کے بعد حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ آ گئے، تو حضرت فرمایا کہ حبیب عجمی! یہ کس کے حوالے کر گئے تھے؟ حضرت اس کے حوالے جس نے اس کی حفاظت کے لیے آپ کو کھڑا فرما دیا۔ تو اب ظاہر کیا نظر آتا ہے کہ شاگرد کامل ہے۔ مگر ہمارے مشائخ نے کہا کہ نہیں نہیں شاگرد کامل نہیں تھا، اس دنیا میں اسباب کے خلاف زندگی گزارنا یہ کوئی کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ ظاہر کی زندگی اسباب کے مطابق ہو مگر انسان کی باطن کی نظر اپنے پروردگار کے اوپر ہو۔

⊙...... چنانچہ اب اس کی مثالیں ذرا سنیے کہ مبتدی اور منتہی کا ظاہر بالکل ایک جیسا ہو جاتا ہے اور ان کے باطن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مبتدی کو بھی نماز میں سجدۂ سہو پیش آتا ہے مگر سجدۂ سہو اس لیے پیش آتا ہے کہ دنیا کی طرف دھیان ہوتا ہے۔ اور منتہی کو بھی سجدۂ سہو پیش آتا ہے مگر وہ اس لیے کہ منتہی کو یادِ الٰہی میں استغراق کی کیفیت ہو جاتی ہے اور اس استغراق میں وہ رکعت بھول جاتا ہے۔ اب فرق دیکھیں، ظاہر میں اس کو بھی سجدہ سہو لگا اور ظاہر میں منتہی کو بھی سجدہ سہو لگا مگر مبتدی کو سجدہ سہو لگنے کی وجہ دنیا تھی اور منتہی کو سجدہ سہو لگنے کی وجہ اللہ کی یاد میں استغراق تھا، لیکن ظاہر تو ایک جیسا نظر آ رہا ہے، گو باطن میں کتنا فرق ہے۔

⊙...... عام آدمی مال سمیٹتا ہے، کیوں؟ حرص کی وجہ سے دنیا کی ہوس کی وجہ سے۔ اس لیے فرمایا کہ انسان کے پیٹ کو قبر کی مٹی بھرتی ہے۔ فرمایا: بندے کو اگر سونے سے بھرا ایک جنگل دے دیا جائے، وہ چاہے گا کہ ایک جنگل اور ہوتا اور اگر وہ بھی دے دیں تو اس کے دل میں ہوگا کہ اس جنگل کو بنانے والا بھی میں ہوتا تو یہ مال کی طلب کس لیے ہے؟ مال کی ہوس کی وجہ سے۔

﴿ وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (سورۃ الفجر: ۲۰)

''اور مال سے بے حد محبت رکھتے ہو''

اس وجہ سے وہ جمع کر رہا ہے اور منتہی کا حال دیکھیے، بخاری شریف کی روایت ہے: حضرت داؤد علیہ السلام ایک ندی پر نہانے تشریف لے گئے، آپ نے کپڑے اتارے، نہانا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے وہاں پر سونے کی ٹڈیوں کو بھیج دیا، ان کی بارش شروع ہو گئی۔ اب جب داؤد علیہ السلام نے دیکھا تو انہوں نے ان کو چننا شروع کر دیا۔ اب اللہ کے پیغمبر علیہ السلام نہا رہے تھے اور نہانے کے دوران ہی ان کو چننا شروع کر دیا۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: میرے پیغمبر علیہ السلام! میں نے آپ کو اتنا مال دیا، اتنی دولت دی اور ابھی بھی آپ اس کو چنتے پھر رہے ہیں۔ جب یہ فرمایا تو داود علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! باوجود تیری اتنی نعمتوں کے لَا غِنَاءَ رَحْمَتِكَ میں تیری رحمت سے مستغنی نہیں ہوں۔ اب بھی میں تیری رحمت کا طلب گار ہوں۔ اب دیکھیے! مال اس نے بھی جمع کیا مگر مال کی محبت کی بنا پر، مال یہ منتہی بھی جمع فرما رہے ہیں مگر کیوں؟ اللہ کی نعمت کی قدر دانی کی بنا پر۔ اللہ! میں تیری نعمتوں سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ تو ظاہر ایک جیسا مگر باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

◉...... چنانچہ عام آدمی بھی کھیلتا ہے بیوی کے ساتھ، کبھی بیٹھ کے شغل لگا لیتا ہے مگر دنیا کی لذت کی خاطر، انجوائے کرنے کی خاطر، یہ مبتدی کا حال۔ اور منتہی سبحان اللہ! نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایک مرتبہ سفر کے دوران رات کے وقت فرمانے لگے کہ عائشہ دوڑیں؟ چنانچہ دوڑ لگائی، نبی علیہ السلام نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو جیتنے دیا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی خوش ہو گئیں۔ کچھ عرصہ گزرا پھر اسی طرح کا معاملہ پیش آیا، فرمایا: دوڑیں؟ پھر دوڑ لگائی، اب نبی علیہ السلام آگے بڑھ گئے اور مسکرا کر دیکھا اور فرمایا کہ عائشہ! تِلْكَ بِتِلْكَ اس وقت تو جیت گئی تھی آج میں جیت گیا تھا، حساب برابر ہو گیا۔ اب منتہی بھی یہ کر رہے ہیں مگر کیوں؟ اپنی اہلیہ کے دل کو خوش کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ پروردگار نے حسنِ معاشرت کا حکم فرمایا۔ اب عمل تو ظاہر میں ایک

جیسا نظر آتا ہے مگر باطن میں دیکھو تو کتنا فرق ہوتا ہے۔

چنانچہ عام آدمی اپنی بیوی کے سامنے کیا کیا باتیں سناتا ہے، کاروایاں ڈالتا ہے، سٹوریاں سناتا ہے اور ادھر دیکھو منتہی سیدنا رسول اللہ ﷺ سنا رہے ہیں: حمیرہ! ایک مرتبہ نو عورتیں پانی بھرنے کے لیے چشمے پر اکٹھی ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ آج ہم کچھ بھی نہیں چھپائیں گی اور سب بات گھر کی کھول کر بیان کر دیں گی۔ ایک نے کہا کہ میرا خاوند ایسا ہے، دوسری نے کہا ایسا ہے، تیسری نے کہا ایسا ہے۔ ایک کے بارے میں فرمایا: اس کا نام ہے ام ذرع، اس نے کہا کہ ابو ذرع کا تو یہ حال ہے مجھے اس نے سونے سے لاد دیا، کھلا کے موٹا کر دیا، خوشیوں سے رکھا، نبی علیہ السلام نے نو عورتوں کی کہانی سنا کر فرمایا کہ عائشہ ابو ذرع جس طرح ام ذرع کے لیے محبت کرنے والا اچھا تھا، میں تیرے لیے اس سے بھی زیادہ اچھا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی خشیت کا اندازہ لگائیے فرمایا: میں انسانوں میں سب سے زیادہ خشوع رکھنے والا ہوں۔ اتنا خوفِ خدا، اتنا خشوع، مگر چونکہ حسنِ معاشرت کا حکم ہے، اللہ نے فرمادیا:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (سورۃ النساء:۱۹)

”تم اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کی زندگی گزارو“

اللہ کے حبیب ان کو نو عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔ تو ظاہر ایک جیسا مگر باطن میں اور نیت میں کتنا زیادہ فرق نظر آتا ہے۔

◉ ...... عام آدمی اگر کہیں جہاد میں جائے بھی سہی تو وہ اپنے آپ کو بچائے گا زرہ پہنے گا۔ کیوں؟ اس کے دل میں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی ضرب لگے گی اور میری جان چلی جائے گی، تو اس نے بھی اپنے جسم کو بچایا مگر ڈر ہے اور اللہ کے حبیب ﷺ نے احد کے میدان میں دو زرعیں پہنیں کیوں؟ اے اللہ! یہ جسم تیری دی ہوئی ایک نعمت ہے اور اب اس نعمت کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے، لہٰذا میں اس کی حفاظت کا حق

ادا کر رہا ہوں تو ظاہر بالکل ایک جیسا لیکن باطن میں بہت زیادہ فرق۔

⊙......ایک تھا حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد کا رونا، مبتدی کا معاملہ دیکھیں، بیٹا گم ہو گیا، چلا گیا، تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد نے اشعار کہے تھے۔ اے زید! مجھے نہیں معلوم کہ تجھے کہیں زمین نے نگل لیا یا تو زندہ ہے، وہ بھی روتے تھے اور اشعار پڑھتے تھے مگر یہ مبتدی کا رونا دنیا میں اپنے بیٹے کے تعلق کی وجہ سے ہے۔ اور ایک ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کا رونا۔ وہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے روتے تھے مگر ان کا رونا کس لیے تھا؟ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بہت عجیب تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنتی حسن کا نمونہ دنیا میں عطا کر دیا تھا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ان کو لوگ دیکھتے تھے تو کہتے تھے۔

﴿مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ (سورۃ یوسف:۳۱)

''یہ بشر نہیں بلکہ یہ تو کوئی فرشتہ ہے''

وہ جنتی حسن کا ایک نمونہ تھا، اللہ نے دنیا میں دکھا دیا۔ لہٰذا اب جب اس نعمت کو گنوا بیٹھے، یا وہ نعمت دور چلی گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں نعمت کی قدردانی کا احساس تھا۔ آپ ان کی جدائی میں اتنا روتے تھے۔

﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ﴾ (سورۃ یوسف:۸۵)

''غم سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں''

تو ان کا رونا دنیا کے لیے نہیں تھا بلکہ ان کا رونا نعمت کی قدردانی کی وجہ سے تھا۔ تو مبتدی اور منتہی کا ظاہر ایک لیکن باطن میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ اس لیے نبی علیہ السلام کا ظاہر اس قدر عام نظر آتا تھا کہ کافر لوگ کہتے تھے۔

﴿مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾

(سورۃ فرقان:۷)

یہ کیسے رسول ہیں کہ کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔

ان کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ظاہر میں کوئی فرق تو نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ زندگی اتنی نارمل تھی کہ باہر سے آنے والے پوچھتے تھے کہ من منکم محمدا کہ تم میں سے محمد ﷺ کون ہیں؟ پتہ ہی نہیں چلتا تھا فرق کا۔ تو ظاہر بالکل ایک لیکن باطن میں بہت زیادہ فرق۔

لہٰذا جو جتنا کامل ہوگا، ظاہر میں اس کی زندگی بالکل عام آدمی کی طرح نظر آئے گی لیکن اگر باطن میں دیکھو تو عام آدمی کو ان کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا یہ جو اکابرین کہا کرتے تھے کہ جنت کو جلا دو دوزخ کو بجھا دو! یہ کلام انہوں نے اس وقت کہا، جب وہ ابھی راستے کے راہی تھے۔ ابھی ان کا نزول مکمل نہیں ہوا تھا۔ نزول مکمل ہونے کے بعد پھر زندگی بالکل جیسے عام آدمی کی ہوتی ہے بالکل عام آدمی کی مانند ہو جاتی ہے۔

حدیث شریف میں جنت مانگنے کی ترغیب:

اس لیے نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ تم دعا مانگو!

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ))

تو ہم جیسے بندے تو ہیں ہی مبتدی، لہٰذا ہمیں تو جنت کی دعا مانگنی چاہیے۔ بلکہ رو رو کے مانگنی چاہیے۔ کس نیت سے؟ اس لیے نہیں کہ جنت میں بڑی نعمتیں ہوں گی اور کھانے پینے کی چیزیں اور حور و قصور ہونگی، نہ نہ! یہ چیزیں تو بہت ہی کم قیمت ہیں۔ جو اصل وجہ جنت مانگنے کی ہے وہ یہ ہے کہ جنت اللہ کی ملاقات گاہ کا دوسرا نام ہے۔ جنت جانے کی توفیق ہو گی تو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا، اس لیے جنت مانگنی چاہیے اور ڈٹ کر مانگنی چاہیے۔

ایک مرتبہ کوئی ایسی ہی رمضان کی رات تھی، مسجد میں بہت سارے لوگ تھے، یہ عاجز بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا، تو قریب میں ایک بڑے میاں دعا مانگ رہے تھے۔ وہ بڑے میاں کی دعا ایسی تھی، بس میں اپنی دعا بھول گیا اور اس کی دعا نے مجھے خوش کر دیا۔ وہ پنجابی میں بیٹھا دعا مانگ رہا تھا، اور دعا مانگتے مانگتے کہتا ہے۔

''اے اللہ! میکوں ہک واری جنت وچ واڑ دیویں، اگاں آپے لگا وتساں''

کہ اے اللہ! ایک مرتبہ مجھے جنت میں داخل میں ہونے دینا، آگے خود ہی پھرتا رہوں گا۔

جنت کیوں مانگیں؟

تو اس لیے ہم جیسے عام آدمی کو اللہ رب العزت سے جنت ضرور مانگنی چاہیے۔ رو رو کے مانگنی چاہیے، مگر نیت کیا ہو؟ یہ نہ ہو کہ کھانے پینے کی چیزیں وہاں بہت ملیں گی۔ نہیں نہیں! دیکھو! مہمانوں کے آنے پر گھر میں دو طرح کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو بچے خوش ہوتے ہیں۔ بچوں کی خوشی کیا ہوتی ہے کہ آج زردہ پکے گا، پلاؤ پکے گا، مہمان جو آ رہے ہیں، تو ان کو کھانے کی خوشی ہوتی ہے۔ اور گھر کے بڑے بھی اس دن خوش ہوتے ہیں، مگر ان کو کھانوں کی خوشی نہیں ہوتی، ان کو مہمان سے ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔ تو ہم بھی جنت کو مانگیں مگر بچوں کی طرح کھانے کی خوشی میں نہیں بلکہ اس مالک الملک کے دیدار کی تمنا میں۔ اللہ سے مانگیں اے اللہ! ہمیں بھی وہی جگہ عطا فرما جہاں آپ کا دیدار ہوا کرتا ہے اور اس کے لیے پھر ہم خوب مجاہدہ کریں، قربانی کریں تا کہ اللہ رب العزت کے ہاں ہماری عبادت قبول ہو جائے۔

اس لیے مومن کے لیے دنیا میں اللہ کے لیے کوئی بھی کام کرنا، مجاہدہ کرنا، سب آسان، محبوب کے لیے سب کچھ قربان کرنا آسان ہو جاتا ہے مگر محبوب کی ملاقات تو جنت میں ہی جا کر ہو گی۔

موت دوست سے ملاقات کا ذریعہ ہے:

اس لیے روایت میں آتا ہے کہ ملک الموت جب ابراھیم علیہ السلام کی روح کو قبض کرنے کے لیے آئے تو بتایا کہ جی مجھے تو آپ کی روح قبض کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

هَلْ رَاَیْتَ خَلِیْلًا یَقْبِضُ رُوْحَ خَلِیْلِهٖ

''کیا تم نے کسی دوست کو دیکھا کہ وہ دوست کی روح کو قبض کر رہا ہو''

ملک الموت حیران، چنانچہ اللہ رب العزت سے عرض کیا کہ ربّ کریم آپ کے خلیل تو یہ فرماتے ہیں، تو رب کریم نے فرمایا کہ جا کران کو یہ کہہ دو!

هَلْ رَاَیْتَ خَلِیْلًا یَکْرَهُ لِقَآءَ خَلِیْلِهٖ

''کیا تم نے کسی دوست کو دیکھا کہ وہ اپنے دوست کی ملاقات کا انکار کر رہا ہو''

یعنی اس کو اچھا نہ سمجھ رہا ہو، اب ابراہیم سمجھ گئے کہ واقعی جب میری روح قبض ہو گی تب مجھے اپنے پروردگار کی لقا نصیب ہو گی۔ فرمانے لگے: ملک الموت!

((عَجِّلْ عَجِّلْ)) (ربیع الابرار، ۴۳۲/۱)

''جلدی کر میری روح کو قبض کر لے مجھے اپنے اللہ سے ملاقات کرنی ہے''

اس لیے ہمارے اکابر موت کا انتظار کرتے تھے اور جب ملک الموت کو دیکھتے تھے تو فرماتے تھے، کتنا اچھا مہمان آیا، میں تو بیس سال سے تمہارے انتظار میں تھا۔ بیس بیس سال سے انتظار میں ہوتے تھے اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے۔

((تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ)) (شعب الایمان، رقم: ۱۰۲۰/۸)

''موت مومن کے لیے تحفہ ہے''

تحفہ کس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات شروع، اس لیے ایک روایت میں فرمایا:

((اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ))(شرح الصدور،۱/۲۳)

کہ موت ایک پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست کے ساتھ ملا دیتی ہے۔

اللہ رب العزت اپنی رحمت سے ہمارے اوپر بھی ایسی مہربانی فرمائے کہ ہمارے لیے اس جگہ پر جانا آسان فرمادے۔

ملاقات کے دو انداز:

جب بھی کوئی آدمی ملتا ہے تو ملاقات کے دو انداز ہوتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے دوست کا انداز، ایک ہوتا ہے دشمن کا انداز۔ دوست کے انداز کی مثال تو یہ کہ جیسے خاوند باہر گیا ہوا تھا، اور سال دو سال کے بعد نوکری سے واپس اپنے ملک آیا اور اس نے بیوی بچوں کو فون کر دیا کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔ اب یہ خبر سنتے ہی بیوی تیاریوں میں لگ جاتی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے گھر کی صفائیاں بچوں کو بھی تیار کر دیتی ہے، کھانے بھی خوب بنا دیتی ہے، خود بھی تیار ہو جاتی ہے اور مہمان کا استقبال ہوتا ہے، اس کے آنے پر خوشی کا اظہار ہوتا ہے، یہ ہے دوست کا ملنا۔

اور ایک ہوتا ہے دشمن کا ملنا کہ آدمی دیکھے، تو اس کو غصہ ہی آجائے۔ تو قیامت کے دن انسان اپنے پروردگار سے دو حالتوں میں ملے گا۔ جو ایمان والا ایمان کو سلامت لے کر چلا گیا، اللہ کے سامنے دوست بن کر پیش ہوگا اور جس نے اللہ رب العزت کے حکموں کی نافرمانیاں کی، ایمان سے محروم رہا، وہ قیامت کے دن اللہ کا دشمن بن کر پیش کیا جائے گا۔ ہمیں یہ دعا کرنی ہے کہ اللہ قیامت والے دن، اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل فرمادے۔

جنت کے مزے:

بہرحال جنتی جب جنت میں چلے جائیں گے تو جنت کی عجیب نعمتیں ہوں گی۔ ان کی تفصیل میں یہ عاجز نہیں پڑنا چاہتا۔ وہاں کے مکان عجیب ہوں گے، خدام عجیب ہوں گے، کھانے عجیب ہوں گے، جنتی وہاں پر خوب مزے میں ہوں گے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ اللہ رب العزت جنتیوں سے ہم کلامی فرمائیں گے اور ہم کلامی میں اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: اے میرے بندو! تم خوش ہو؟ تو جنتی بتائیں گے کہ اے اللہ! ہم بڑے خوش ہیں، بڑے مزے میں ہیں، آپ کی نعمتیں ہیں اور مزے کر رہے ہیں۔ اور کہیں گے کہ اللہ ہم آپ سے راضی ہیں۔ اور جب بندے یہ کہیں گے کہ اللہ ہم آپ سے راضی ہیں، اب روایت میں آتا ہے: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میرے بندو! تم مجھ سے راضی میں تم سے راضی، اب میں کبھی تم سے خفا نہیں ہوں گا۔ جب یہ اعلان ہوگا تو جنتیوں کو اتنا مزہ آئے گا، اتنا مزہ آئے گا کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی ہے اور اب کبھی بھی ہم سے خفا نہیں ہوگا تو جنتی اور مزے اڑائیں گے۔

مزید نعمت:

بالآخر جب خوب مزے اڑائیں گے، سالوں گزر جائیں گے، ہزاروں لاکھوں سال۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے دوبارہ ہم کلامی فرمائیں گے۔ میرے بندو! تمہیں کچھ اور چاہیے وہ کہیں گے کہ اے اللہ! سب کچھ تو موجود ہے، جو چاہتے ہیں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اچھا تم ذرا اپنے علما سے رجوع کرو۔ ذمہ داری سے عرض کر رہا ہوں، کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگ جہاں جہاں جمعہ ادا کرتے ہوں گے اپنے علاقے کے ان علما کی طرف رجوع کریں گے اور ان کو کہیں گے کہ جی ہمیں فرمایا گیا ہے کہ علما سے رجوع کرو! اب ہم کیا کہیں؟ تو علما اس وقت کہیں گے کہ ہاں آپ

گو نعمتیں سب مل گئیں ایک نعمت ابھی اور ہے وہ نہیں ملی۔ وہ کہیں گے کون سی نعمت؟ وہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا:

﴿ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴾ (سورۃ ق:۳۵)

کہ جنت میں ان کو ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ان کو مزید بھی ملے گا۔

مزید سے کیا مراد کہ ان کو اللہ رب العزت کا دیدار نصیب ہوگا اور ابھی تک تو دیدار نصیب نہیں ہوا۔ اب جنتیوں کی توجہ اُدھر جائے گی تو جنتی اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگیں گے کہ اللہ! اپنا دیدار عطا فرما دیجیے۔ اے کریم آقا! میزبان گھر تو سارا دکھا دے اور خود ملاقات نہ کرے تو مہمان نوازی کا کیا لطف ہوا؟ آپ نے جنت دے دی، جنت دکھا دی، مگر آپ نے اپنا دیدار تو نہیں کروایا، اے اللہ! اپنے دیدار سے مشرف فرما دیجیے، اپنے دیدار سے ہمیں عزت عطا فرما دیجیے۔

دیدارِ الٰہی کی تیاری:

پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا تم اس کے لیے تیاری کرو۔ دنیا میں لوگ جیسے شادی کے لیے تیاری کرتے ہیں تو جنتی اس تقریب کے لیے تیاری کریں گے۔ تیاری کیا ہوگی؟ جنت میں ایک بازار ہوگا جو حسن کا بازار کہلائے گا۔ یہ وہاں جائیں گے اور وہاں یہ جیسا چاہیں گے، ویسا حسن و جمال مل جائے گا، من پسند کا حسن و جمال۔ وہ بھی کیا عجیب جگہ ہوگی اللہ اکبر کبیرا۔ تو جب من پسند کا حسن و جمال ملے، گا تیاری کر لیں گے، تو پھر سب جنت عدن کی طرف چلیں گے۔

جب وہاں پہنچیں گے تو ایک دریا ہوگا اس کے کناروں کے اوپر کرسیاں لگی ہوں گی، ان کرسیوں پر ان کو بٹھایا جائے گا۔ فرشتے آئیں گے اور ہر ہر جنتی کو ریشم کی ایک پوشاک پہنائیں گے۔ آج دنیا میں جیسے گاؤن پہنا دیتے ہیں، اسی طرح ہر ہر جنتی کو اللہ رب العزت کی طرف سے ایک گاؤن ریشم کا پہنایا جائے گا، پھر اس کے

بعد سب کی دعوت ہوگی۔ ادنیٰ جنتی کے سامنے ستر ہزار پلیٹوں میں کھانا رکھا جائے گا، ادنیٰ جنتی کے سامنے عورتوں کو جو پوشاک ملے گی، ہر پوشاک کے اندر سے ستر ہزار رنگ جھلک رہے ہوں گے۔ کیا وہ جگہ ہوگی؟ کیا مزے ہوں گے؟

مجلسِ دیدار:

وہاں خیر جب خوب کھا پی لیں گے، اب اس کے بعد مجلس شروع ہوگی۔ داؤد علیہ السلام تلاوت فرمائیں گے۔ پھر نبی علیہ السلام تلاوت فرمائیں گے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ پھر خود اللہ تعالیٰ سورۃ یٰسین کی تلاوت فرمائیں گے۔ اللہ اکبر! کیا مزہ ہوگا جب اللہ رب العزت سورۃ یٰسین کی تلاوت فرمائیں گے اور جنتی سن رہے ہوں گے۔ سننے کا مزہ کتنا ہوگا؟ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان کو اپنا دیدار عطا فرمائیں گے۔ یہ دیدار کیسے ہوگا؟ علما نے لکھا: بے جہت، بے کیف، بے شبہ، بے مثال ہوگا۔ اس میں آپ جہت کا تعین نہیں کر سکتے، کیفیت نہیں بتا سکتے، تشبیہ بھی نہیں دے سکتے، مثال بھی کوئی نہیں دے سکتے لیکن دیدار ہوگا اللہ تعالیٰ کا۔ اس دیدار کے وقت جنتیوں کو اتنا مزہ آئے گا کہ ان پر ایک عجیب حال طاری ہو جائے گا۔ آج دنیا کی کوئی خوبصورت چیز دیکھ کر کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اللہ رب العزت کے حسن جمال کو جو دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کئی لاکھ سال تک جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتے رہیں گے۔

دیدار ختم کیسے ہوگا؟

اب یہاں پر ایک علمی نکتہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور جنتی دیدار کریں گے تو پھر دیدار ختم کیسے ہوگا؟ اگر یہ کہیں کہ جنتی تھک جائیں گے دیدار کر کر کے اور پھر اپنے گھروں کو آجائیں گے تو یہ جنتیوں کے

لیے باعثِ ندامت ہے کہ محبوب کی تجلی ہے اور یہ تھک کر کسی اور طرف مشغول ہو جائیں تو عاشق کے لیے باعثِ ندامت ہے۔ اور اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ دیدار ختم کروا دیں گے جبکہ جنتی کرنا چاہیں گے، فرماتے ہیں کہ اس میں شبہ بخالت ہے۔ یہ تو بخیل ہوتا ہے، جیسے اگر ماں کا دودھ تھوڑا ہے، بچہ رو ہی رہا ہوتا ہے، وہ سینے سے الگ کر دیتی ہے تو جنتی دیدار کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو الگ کر دیں تو اس میں بخالت کا شبہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دیدار ختم کیسے ہوگا؟ اگر کہیں گے کہ مومن دیکھنا بند کر دیں تو یہ بھی ماننے کی بات نہیں۔ ارے اللہ کا دیدار کرنے والے، اللہ پہ مرنے والے، وہ کیسے اس دیدار سے تھک سکیں گے۔ نہیں تھکیں گے، دیکھتے نہیں ایک مکھی حلوائی کی دکان پر جاتی ہے حلوائی بھگاتا ہے۔ لیکن وہ دکان سے جاتی نہیں۔

مگس ہرگز نہ خواہد رفت از دکان حلوائی

''مکھی حلوائی کی دکان سے ہرگز نہیں جانا چاہتی''

مومن اپنے رب کی زیارت سے کیسے تھک جائے گا؟ کیسے اس کا جی بھر سکتا ہے، نہ مومن پیچھے ہٹے گا اور نہ اللہ تعالیٰ اس مومن کو زبردستی پیچھے ہٹائیں گے۔ تو پھر دیدار ختم کیسے ہوگا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کی صورت یہ بنے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات دو طرح کی ہیں۔ ایک جمال والی تجلیات، ایک جلال والی تجلیات۔ تو جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے بندے دیدار کریں تو جمال والی تجلیات بھیجتے رہیں گے، بندے دیدار میں مگن رہیں گے اور جب چاہیں گے کہ اب تھوڑا Relax (ستا) لیں تو جلال کی تجلیات بھیجیں گے۔ مخلوق اس وقت پھر اپنے اپنے گھروں میں آکر باقی چیزوں میں مصروف ہو جائے گی۔ یہ دو مختلف طرح کی تجلیات ہوں گی، ان کے ذریعے سے اللہ کا دیدار ہوا کرے گا۔

جنتیوں کے حسن میں اضافہ:

لیکن جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت نور کی ایک آندھی چلے گی، جیسے آج کل مٹی کی آندھی چلتی ہے تو آندھی میں بندوں کے چہروں پر بھی مٹی نظر آتی ہے، کپڑوں پر بھی مٹی نظر آتی ہے۔ تو جب یہ نور کی آندھی چلے گی تو جتنے بھی جنتی ہوں گے ان سب کے اوپر نور کی تہہ جم جائے گی۔ چہروں پر نور کی تہہ اور اس وجہ سے جنتیوں کے حسن میں اضافہ ہو جائے گا۔

حسن میں اضافہ کتنا ہوگا؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری بات لکھی۔ وہ فرماتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب جنتی جنت میں جائیں گے اور پہلی مرتبہ جنتی مخلوق کو دیکھیں گے تو اتنا حیران ہوں گے کہ پانچ سو سال ٹکٹکی باندھ کر ان کو دیکھتے رہیں گے، وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ پانچ سو سال مبہوت ہو کر دیکھتے رہیں گے، اتنا ان کے حسن سے متاثر ہوں گے۔ لیکن جب یہی جنتی اللہ رب العزت کا دیدار کر کے واپس لوٹیں گے تو اب ان کا اپنا حسن اتنا بڑھ چکا ہوگا کہ واپس آئیں گے تو جنتی مخلوق یہ حور و غلمان پانچ سو سال ٹکٹکی باندھ کر ان جنتیوں کے حسن کو دیکھتے رہ جائیں گے۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب گھر کے خادم اتنے حسین ہوں تو گھر کے مالک کے حسن جمال کا کیا عالم ہوگا؟ جب نوکروں کے اوپر اللہ نے فرما دیا:

﴿ اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴾ (سورۃ الدھر: ۱۹)

تو پھر گھر کے مالک کے حسن و جمال کا کیا عالم ہوگا؟ آج کل کے نوجوان بس حور و قصور کے شوق میں خوب عبادتیں کرتے ہیں۔ بھئی یہ حوریں جنت کی خادمائیں ہیں۔ جب خادمائیں اتنا حسن و جمال رکھتی ہوں گی تو ایمان والی عورتیں جو جنت کی مالکہ بنیں گی، سوچیے ان کے حسن و جمال کا کیا عالم ہوگا؟ یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ گھر کی ماسی خوبصورت ہو اور مالکہ خوبصورت نہ ہو۔ یہ تو کام کرنے والی ماسیاں ہیں، ان پر

ہی فریفتہ ہوئے پھرتے ہیں نبی علیہ السلام نے عائشہ صدیقہ کو فرمایا کہ جنتی عورت کو اتنا حسن و جمال دیا جائے گا کہ حور عین بھی اس کے حسن و جمال پر حیرانی کا اظہار کرے گی۔ اللہ اکبر کبیرا!!

حال کیا ہو گا بھلا ان کا تیری دید کے دن
جن کا دل جوش میں آئے ہے تیری یاد کے ساتھ

یا اللہ جن کا فقط تیرا نام سن کر دل جوش میں آجاتا ہے، جب وہ تیرا دیدار کر رہے ہوں گے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا۔

دیدار کے مراتب میں فرق:

اب یہ دیدار کچھ لوگوں کو زیادہ ہوگا، کچھ کو کم ہوگا کچھ کو ایک مرتبہ ہوگا، کچھ کو روزانہ ایک مرتبہ، بعض کو دن میں دو مرتبہ چنانچہ روح المعانی میں یہ حدیث نقل کی گئی، فرماتے ہیں:

((اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يَدْخُلُوْنَ عَلَى الْجَبَّارِ كُلَّ يَوْمٍ مَرَّتَيْنِ))
(کنز العمال رقم: ۳۹۳۲۵)

''کہ اہلِ جنت دو مرتبہ اللہ رب العزت کا دیدار کر پائیں گے''

جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار:

روایت میں آتا ہے کہ جنتی جس وقت میں نماز پڑھتے ہوں گے۔ جب وہ وقت ہوگا تو جتنے جنت کے درخت ہوں گے ان تمام درختوں کے پتوں میں سے اللہ اکبر کی آواز آنی شروع ہو جائے گی۔ جنتی بھی اللہ اکبر کہیں گے، حور و غلمان سب اللہ اکبر کہیں گے۔ اس اللہ اکبر کی آواز سے جنتی پہچان لیں گے کہ ہاں اس وقت ہم فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہم اس وقت ظہر کی نماز پڑھا کرتے تھے، عصر کی نماز پڑھا کرتے تھے

اور جب شام کا وقت ہوگا تو عرش کے پردے گرا دیے جائیں گے۔ اب پتہ چل جائے گا کہ بھئی اب رات کا وقت ہو گیا ہے۔ تو پھر فرماتے ہیں کہ جب جمعہ کا دن آئے گا تو جمعہ کے دن جنتیوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، پتہ چل جائے گا کہ اس دن جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوگا تو عید کے دن فرشتے اللہ رب العزت کی طرف سے ہر ہر جنتی کے لیے ڈبے میں بند ایک تحفہ لائیں گے جو جنتی کو عطا کر دیا جائے گا۔ جنتیوں کو عیدی ملے گی ماشاء اللہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ آج کسی کی طرف جب ڈبہ آتا ہے ڈبہ اٹھا کے خوشی ہوتی ہے اور وہ TCS کا ڈبہ تو اللہ کی طرف سے آئے گا، پتہ نہیں اس میں کیا نعمتیں ہونگی!

نابینا کو اللہ تعالیٰ کا دیدار:

لیکن ایک بات ذرا غور طلب ہے، ذرا توجہ فرمایئے! وہ نابینا جو دنیا میں نابینا پیدا ہوا لیکن وہ اللہ کی رضا پر راضی رہا، صبر کیا، اس نے نیکی کی زندگی گزاری، یہ جب جنت میں جائے گا تو اس کو دن میں ایک مرتبہ دیدار نہیں ہوگا بلکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ کی تجلی ہر وقت اس پر پڑے گی اور یہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے اللہ کا دیدار کرتا رہے گا۔ اللہ فرمائیں گے کہ میرا یہ وہ بندہ ہے جس نے دنیا میں کسی غیر کو نہیں دیکھا۔ آج میرا اس کے سامنے حسن و جمال ہے، یہ جتنا چاہے میرے دیدار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر لے۔

غیر محرم سے نظر ہٹانے والے کو اللہ تعالیٰ کا دیدار:

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر آدمی غیر محرم کو دیکھنے پر قادر ہو مگر اللہ رب العزت کے ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ غیر محرم سے نظریں ہٹا لے تو ہر مرتبہ نظر بچانے کے صدقے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں ایک مرتبہ اپنے چہرے کا دیدار نصیب فرمائیں

گے۔آج غیر محرم سے نظر بچائیے پھر دیکھیے ، جنت میں کیا اس کا بدلہ اور انعام نصیب ہوگا۔

نماز کی کیفیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا دیدار:

یہاں پر ایک اور نکتے والی بات کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کو جو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا، اس کی کیفیت بھی مختلف ہوگی۔ وہ کیسے؟ وہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ دنیا میں جیسی نمازیں پڑھیں گے ویسی ہی جنت میں اللہ تعالیٰ سے دیدار کی کیفیت ہوگی۔ مثال کے طور پر جو حضوری کے ساتھ نماز پڑھیں گے ان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار بغیر کسی پردے کے ہوگا اور جن کی نماز میں ادھر ادھر کے خیال آتے جاتے ہوں گے ان کو اللہ کا دیدار تو ہوگا مگر اس دیدار کے وقت نورانی پردے درمیان میں حائل ہوتے جائیں گے۔ اب ہم اللہ تعالیٰ کا دیدار کیسا کرنا چاہتے ہیں؟ بھئی! بغیر نورانی پردوں کے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو ستر ہزار پردوں سے تجلی ڈالی گئی تھی ، ہم چاہتے ہیں کہ جنت میں نورانی پردے درمیان میں نہ ہوں۔ بھئی! خاوند نے دلہن کو دیکھا، اس نے پتلا کپڑا اوپر کر لیا تو کیا مزہ؟ مزہ تو یہی ہے نا خاوند کے لیے کہ وہ پردے کو ہٹا لے۔ تو جنت میں جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو پردوں کا کیا مطلب؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ایسا دیدار نصیب ہو تو پھر ہمیں آج نمازیں بھی ایسی حضوری والی پڑھنی چاہییں۔

قرب کی تمنا:

اس لیے دعائیں جب مانگیں تو جنت میں اس کا قرب مانگا کریں۔ رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ کسی نے کہا کہ اللہ آپ کو جنت میں گھر عطا فرمائے تو جواب میں فرمانے لگی:

اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ

"پہلے پڑوسی بعد میں گھر"

یعنی اے اللہ! تو جنت میں اپنے پڑوس میں گھر عطا فرما دے۔ چنانچہ بی بی آسیہ فرعون کی اہلیہ، جب ایمان لے آئی، فرعون نے اپنے گھر سے نکال دیا۔ عورت کے لیے بے گھر ہو جانا بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ اس صدمے میں بی بی آسیہ نے اللہ سے دعا مانگی: اے اللہ! اس ظالم نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا، اے اللہ! اس کے بدلے میں تو جنت میں مجھے اپنے قرب میں گھر عطا فرما دے! اللہ کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ رب کریم نے قرآن کا ایک حصہ بنا لیا کہ اس نے یہ دعا مانگی تھی۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (سورۃ التحریم:۱۱)

اللہ جنت میں اپنے پڑوس کا گھر عطا فرما دے! اللہ اکبر کبیرا

دیدار سے محروم، بڑا محروم:

جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، جنتیوں کے اوپر عجیب مستی کا عالم ہوگا۔

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں

تو جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو دیکھو کہ ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں۔ تو سب جنون کی حالت میں ہوں گے۔ اس وقت کیا اللہ رب العزت کے دیدار کے مزے ہوں گے اور واقعی جو اللہ کے دیدار سے محروم رہ گیا وہ بہت بڑا محروم ہے، بہت بڑا محروم ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا ام المومنین روایت فرماتی ہیں کہ نبی علیہ السلام ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور میں والد کے گھر میں تھی۔ تو نبی علیہ السلام کمرے میں وہیں ساتھ ٹھہر گئے۔ فرماتی ہیں کہ میں نبی علیہ السلام کے ساتھ ایک بستر پر سو گئی، اچانک مجھے اپنے رخسار کے اوپر کوئی چیز محسوس ہوئی، میں نے ہاتھ

لگایا تو پانی...... میں حیران کہ یہ پانی کہاں سے آیا؟ کہنے لگیں کہ میں اٹھی آنکھیں کھولیں دیکھا کہ نبی علیہ السلام کی مبارک آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے تھے اور وہ آنسو میرے رخسار پر آئے ہوئے تھے۔ تو میں اٹھ بیٹھی، میں نے کہا: اے اللہ کے پیارے نبی! اِلِمَ تَبْکِی آپ کیوں رو رہے ہیں؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ حفصہ تم سن نہیں رہی؟ میں نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ کیا؟ فرمانے لگے کہ میرے بھائی عبد اللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ صحن میں تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے اور تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ (سورۃ المطففین:۱۵)

''اس دن وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہوں گے،''

ان کو اللہ کا دیدار نہیں ہو سکے گا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے جب یہ آیت سنی، آنکھوں میں سے آنسوں رواں ہو گئے۔ واقعی اللہ کا دیدار نصیب نہ ہونا یہ تو بہت بڑی محرومی ہے۔

سستا سودا:

اس لیے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ اے ربِّ کریم! ہمیں جنت عطا فرما دیجیے! اس لیے کہ جس کو جنت مل گئی اس کو یقیناً آپ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اور اب اس کی خاطر جو بھی محنت کرنی پڑے، وہ محنت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں کیا محنت ہے جو ہم کر لیتے ہیں۔ کہنے والے نے کہا:

نور میں ہو یا نار میں رہنا
ہر جگہ ذکرِ یار میں رہنا
چند جھونکے خزاں کے بس سہہ لو
پھر ہمیشہ بہار میں رہنا

یہ دنیا کی زندگی کے چند جھونکے ہیں، ہم یہ سہہ لیں پھر اس کے بعد ہمیشہ بہار میں رہیں گے۔ اس لیے اللہ والوں کو یہاں کے مجاہدے، مجاہدے نظر ہی نہیں آتے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں:

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ای
نرخ بالا کن کے ارزانی ہنوز

اے اللہ! آپ نے اپنے ملنے کی قیمت دو عالم کو رکھ دیا کہ دنیا مافیہا سے تم نگاہیں ہٹالو، فرماتے ہیں: اے اللہ! قیمت بڑھا دیجیے یہ تو بڑا سستا سودا کر رہے۔ آپ کے لیے تو ہم دونوں جہانوں کو چھوڑنے کے تیار ہیں اور واقعی بات ایسی ہے مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب شعر کہا، توجہ سے سنیے فرماتے ہیں:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب میں سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں کہ وہ پیغامِ قضا میرے لیے ہے
یوں تو ابر فضا پہ فدا ہیں سبھی میکش
مگر آج کی گنگھور گھٹا میرے لیے ہے
اللہ کے رستے کی جو موت آئے مسیحا
اکسیر یہی ایک دوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اتنا کچھ دے کر بھی اگر ہمیں اللہ رب العزت کا دیدار مل جائے تو یہ بہت سستا سودا ہے کہنے والے کہا ۔

جمالِ چند دادم بہ فریدم
بحمد للہ کہ ارزاں خریدم

عشاق بلا حساب جنت میں:

اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے قیامت کے دن جنت کے دروازے پر پہنچے ہوئے ہوں گے۔ رضوان پوچھیں گے: یا اللہ! یہ کچھ لوگ ہیں، جنت کے دروازے پر ہی پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، رضوان! یہ میرے عشاق ہیں، یہ دنیا میں جیتے ہی میرے وصل کی تمنا میں تھے۔ ان کا راتوں کا جاگنا میرے لیے، ان کی دن کی عبادتیں میرے لیے، ان کی زندگی کی ایک ہی خواہش اور تمنا تھی کہ انہیں میرا دیدار نصیب ہو جائے۔ اس لیے میرے دیدار کی تمنا میں یہ جنت کے دروازے پر آپہنچے۔ رضوان جنت کے دروازے کو کھول دے، ان کو بغیر حساب کتاب اندر داخل ہونے دے۔ کیسے خوش نصیب لوگ ہوں گے جن کو اللہ رب العزت کا دیدار نصیب ہوگا۔

تو دنیا میں یہ نعمت نہیں مل سکتی، ہاں آخرت میں جنت کا وعدہ ہے اور اس کے لیے ہم یہاں تیاری کر لیں۔ دنیا میں لوگ کہتے ہیں کہ محبوب کو دیکھ کر ہماری کیفیت اچھی ہو جاتی ہے۔

ہر چند پیر خفتاں بس ناتواں شدم
ہر گاہ نظر بروئے تو کردن جواں شدم

تو پھر جو اللہ رب العزت کا دیدار کریں گے ان کی کیفیت کیا ہوگی؟ اسی کے لیے تو آپ آج یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ کل قیامت کے دن کہہ سکیں گے، میرے مولیٰ تیری تلاش میں ہم نے بہت سفر کر لیے۔

میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی طلب میں

اللہ میں دیکھتا تو آپ کو چاہتا تھا، ثواب آپ کا چاہتا تھا، رضا آپ کی چاہتا تھا، میرے مولیٰ جدھر خوشبو نظر آتی تھی میں ادھر کو بھاگ جاتا تھا، میرے مولیٰ رحمت فرما دیجیے۔ ہمیں اس جگہ سے خالی ہاتھ نہ لٹایئے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیٰمہ:۲۲،۲۳)

''اس دن چہرے ہوں گے جو تر و تازہ ہوں گے''

اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اس لیے کہنے والے نے کہا:

زندگی پر بہار ہوتی ہے
جب خدا پر نثار ہوتی ہے

اللہ پر اپنی زندگیوں کو قربان کر دیجیے!

اللہ تعالیٰ بھی مشتاق ہیں:

ہم اللہ سے محبت کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ہم سے محبت فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((اَلَا طَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ اِلٰى لِقَائِيْ وَ اَنَا اِلٰى لِقَائِهِمْ لَاَشَدُّ شَوْقًا))

(جامع الحدیث، رقم ۱۵:۱۱۴)

''جان لو! میرے چاہنے والوں کا شوق میری ملاقات کے لیے بڑھ گیا اور میں ان کی ملاقات کے لیے، ان سے بھی زیادہ مشتاق ہوں''

اور جب محبوب محبت کرتے ہیں تو پھر تو بندے کا حال ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں فارسی کا ایک شعر لکھتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است و قفیز
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیز

عاشق عاشقان بدن لاغر کند
عشق معشوقاں بدن فربا کند

جو معشوقوں کا عشق ہوتا ہے وہ چھپا ہوا ہوتا ہے، وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ وہ بھی محبت کو چاہتے ہیں، اور محبّ تو پھر نعرے لگاتا ہے۔ اور عاشق کا جو عشق ہوتا ہے وہ تو ڈھولوں کے ساتھ ہوتا ہے، آہیں بھرتا ہے، نعرے لگاتا ہے، عاشق کا کام ایسا ہوتا ہے۔ اور جو عاشقوں کا عشق ہوتا ہے اس میں محبّ کا بدن لاغر ہوتا جاتا ہے، سکڑتا جاتا ہے، بچارا، سوکھتا جاتا ہے، محبت میں۔ اور جب محبوب کسی سے محبت کرنے لگ جائے تو پھر عاشق کا وزن بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

تیری اک نگاہ کی بات ہے:

تو بھئی! ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں، اللہ رب العزت ہم سے محبت فرمالے۔ بس یہ تمنا دل میں ہو کہ اے مالک! ہم ایسے بن جائیں کہ آپ کو پسند آجائیں۔ اے کریم پروردگار! ایک مرتبہ اس مجمع کو محبت کی نظر سے دیکھ لیجیے ؎

تیری اک نگاہ کی بات ہے
میری زندگی کا سوال ہے

اے اللہ! ایک نظرِ رحمت کی ڈال لیجیے، آپ کی ایک نگاہ پر ہمارا کام بنے گا۔ نہیں! آپ کی نیم نگاہ سے ہمارا کام بن جائے گا۔ اک نظر تو فرما دیجیے! ایک بزرگ تھے، کسی نے پوچھا کہ حضرت عید کب ہوگی؟ جواب میں فرمانے لگے:

جب دید ہو گی ، تب عید ہو گی

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں ؎

عید گاہِ ماں غریباں کوئے تو
انبساطِ عید دیدنِ روئے تو
صد ہلالِ عید قربانت کنم
اے ہلالِ عید ما ابروئے تو

''کہ ہم غریبوں کی عید گاہ تو بس تیرا دیدار ہے۔ تو ہے تو وہاں جانا ہی ہماری عید گاہ ہے۔ عید کی خوشی کیا کہ آپ کے چہرے کو دیکھ لینے میں عید کے سو ہلال آپ پر قربان کردوں، تیری تو ابرو میرے لیے عید کا چاند بن جاتی ہے''

واقعی جو اللہ رب العزت سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، وہ اللہ رب العزت سے ایسے ٹوٹ کے پیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی سچی محبت عطا فرمائے۔ صبح سے شام تک ہر وقت یہ دھیان رہے کہ اے اللہ! کوئی عمل ہم ایسا کر جائیں کہ آپ کو پسند آجائے۔ ہر کام سنت کے مطابق کرتے ہوئے دل میں یہ تمنا رکھیں کہ اے اللہ! آپ محبت کی ایک نظر فرما دیجیے، اے اللہ! ہمیں آپ پسند فرما لیجیے! میرے اللہ! آپ کی رحمت کی ایک نظر ہو جائے گی تو ہمارا بھی بیڑا پار ہو جائے گا۔ اب اس کے لیے اے اللہ! ہم حاضر ہیں۔ اس کے لیے ہم عاجز مسکینوں پر مہربانی فرما لیجیے۔ ہم مجاہدوں کے قابل نہیں ہیں، امتحان کے قابل نہیں ہیں، اے اللہ! ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما دیجیے، نرمی کا معاملہ فرما دیجیے۔ اے میرے مولیٰ! جب آپ کی رحمت کی نظر اٹھتی ہے، فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کو ڈاکوؤں کی سرداری سے نکال کر ولیوں کا سردار بنا دیتے ہیں۔ رحمت کی نظر پڑتی ہے، بشر حافی کو گلیوں میں شراب پینے والے کو اے اللہ! آپ نکال کر ولیوں کی فہرست میں شامل فرما دیتے ہیں۔ جب آپ کی رحمت کی نظر اٹھتی ہے، مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کو دنیا کی شراب چھڑا کر اپنی محبت کی شراب پلا دیتے ہیں۔ میرے مولیٰ! جب آپ کی رحمت کا یہ

معاملہ ہے ہم جیسے عاجز مسکین، آج آپ کے گھر میں حاضر ہیں، آپ کے سامنے دامن پھیلائے بیٹھے ہیں، اپنے عمل کو دیکھتے ہیں تو دل میں ڈر لگ جاتا ہے، آپ کی رحمت کو دیکھتے ہیں، امید لگ جاتی ہے۔اے کریم آقا! ہم پر رحمت کی نظر فرما دیجیے! اور ہماری اس حاضری کو قبول کر لیجیے! اور ہمیں بھی اپنے چاہنے والوں کی فہرست میں شامل فرما دیجیے اور اے اللہ! قیامت کے دن ہم ایسے حال میں کھڑے ہوں کہ آپ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں اور ہم آپ کو دیکھ کر مسکرائیں اور آواز آئے:

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝﴾ (سورۃ الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

• وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾
(الحجر:۹)
حفاظتِ قرآن
بیان:
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی
مجددی مدظلہم

اقتباس

اب دیکھیں اگر کوئی بادشاہ یہ کمٹمنٹ کرے کہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری میرے اوپر ہے، میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں تو خود تونہیں جا کر چاروں طرف پہرا دے سکتا۔ اس کے لیے وہ ایک فوج تیار کرتا ہے، فوجی کا سٹیٹس اچھا ہوتا ہے، تنخواہیں اچھی ہوتی ہیں، غذا اچھی ہوتی ہے، چن چن کر لوگ فوج میں رکھے جاتے ہیں...... اور پھر ان کو اس کام پر لگایا جاتا ہے کہ جی آپ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ تو حفاظت تو فوج کرتی ہے مگر بادشاہ کہتا ہے کہ دیکھو میں نے اس کے ذریعے سے اپنے اس کام کو کر دکھایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ کام یوں کیا کہ اپنے بندوں میں سے کچھ ایسے بندے چنے جن کے دلوں میں قرآن مجید کی محبت ڈال دی کہ میں قرآن پاک کا حافظ بنوں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

حفاظتِ قرآن

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

حفاظتِ قرآن کی ذمہ داری:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

’’بیشک اس نصیحت نامے کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی حفاظت کی خود ذمہ داری لی ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ تین آسمانی کتابیں اور بھی ہیں تورات، انجیل، زبور، وہ بھی تو آسمانی کتابیں تھیں لیکن ان کے اندر تحریف ہوگئی ایسا کیوں ہوا؟ یہاں پر یہ نکتہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو پہلی تین ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابی شکل میں بھیجی گئیں، صحیفے بھیجے گئے، لکھی ہوئی کتابیں بھیجی گئیں، وہ اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود نہیں لی۔ قرآن مجید کے

بارے میں کہا گیا کہ یہ صرف پیغام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

((تبرَّكُ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّهُ كَلَامُ اللهِ)) (کنز العمال، رقم:۲۳۶۴)

''قرآن سے برکت حاصل کرو، بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے''

نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ تم قرآن مجید سے برکت پاؤ اس لیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔اب اس کو یوں سمجھیں ایک ہوتا ہے کہ کوئی آدمی آپ کو خط لکھے، اس میں محبت کا اظہار ہوتا ہے، پیغام مل جاتا ہے۔ ایک ہوتا ہے کہ وہ آپ سے ٹیلی فون پر بات کرے اور آپ اس کی آواز کو سنیں۔اب آپ اس کے لہجے کو بھی سنیں گے، اس کی گرم جوشی دیکھیں گے، اس کا انداز ملاحظہ کریں گے۔تو خط میں لکھ کر بات کرنا کچھ اور ہوتا ہے اور ٹیلی فون سے بات کرنا کچھ اور ہے۔تو جو پہلی تین کتابیں تھیں ان کی حیثیت مکتوب کی مانند تھی، خط آ گیا، رقعہ آ گیا، کتاب آ گئی۔جب کہ قرآن پاک یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، جبرئیل علیہ السلام نے اسے نبی ﷺ تک پہنچایا۔ اب دیکھیں کہ ہم جب انٹرنیٹ کے اوپر کسی سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ بندہ ہم سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوتا ہے تو ہماری آواز الیکٹریکل سگنل میں Convert (تبدیل) ہو کر اتنی مسافت طے کر لیتی ہے اور وہاں جا کر دوبارہ آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔تو نبی علیہ السلام پر جب یہ کلام نازل ہوتا تھا تو اسی طرح میسج کی شکل میں آیا کرتا تھا۔

نزولِ وحی کی حقیقت:

چنانچہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جب وحی اترتی تھی سلسلة الجرس کی صورت جیسے دور سے گھنٹی بجنے کی آواز آ رہی ہوتی ہے، یوں محسوس ہوتا تھا۔اب گھنٹی بجنے میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ انسان کو جب دور سے گھنٹی بجنے کی آواز آئے تو سمت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے، مشرق سے ہے یا مغرب سے، کدھر سے ہے۔یعنی

ہمہ جہت وہ پیغام ہوتا ہے، تو یہ پیغام چلتا تھا، اس کی ڈائریکشن کا تعین کرنا مشکل تھا، یہ ہر ڈائریکشن سے پیغام رسیو ہوتا تھا۔

دوسرا یہ کہ یہ جو گھنٹی ہوتی ہے یہ Periodic Wave کی طرح بجتی ہے، پھر رکتی ہے، پھر بجتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل جتنے Messages ہیں وہ اسی طرح Messages (پیغامات) پیکٹ کی حیثیت میں جا رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا یہ پیغام چلتا تھا، کہاں پر؟ نبی ﷺ کے قلب مبارک پر۔

﴿نَزَّلَ عَلٰى قَلْبِكَ﴾

''یہ آپ کے دل پہ اترتا تھا''

اور انسان کا دل انٹینا ہے، یہ اس آسمانی پیغام کو وصول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر کسی کے انٹینا کی بیٹری ہی ڈسچارج ہو جائے تو وہ تو ایسے ہے جیسے سیل فون کی بیٹری فلیٹ ہو گئی۔ کال کرنے والے کرتے رہیں اس نے کوئی رسپانس ہی نہیں دینا۔ لیکن اگر بیٹری ٹھیک ہو تو جو کوئی کال کرے گا تو کال رسیو ہو گی۔ بالکل اسی طرح انسان اپنے دل کے انٹینا کے ذریعے یہ پیغام رسیو کر سکتا ہے۔ کفر کی دنیا پانچ حواس کو تسلیم کرتی ہے اور جہاں پھنس جاتی ہے وہاں کہتی ہے کہ چھٹی حس نے بتایا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ جو پریشان ہو کر چھٹی حس کا نام لیتے ہیں وہ اصل میں انسان کا قلب ہے۔ یہ چھٹی حس ہے بندے کی۔ یہ انسان کو بتا دیتا ہے اب کچھ ہونے والا ہے، کوئی خطرہ ہے۔ تو کفر کی دنیا میں مجبوراً یہ مانا جاتا ہے، ہم اس کو باضابطہ ایک حس مانتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ الہام یا وحی، اللہ کی طرف سے بندے کے دل میں آتی ہے۔ تو دل ایک حس ہے اور یہ باقی حسوں سے زیادہ بہتر حس ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان اللہ رب العزت کے پیغام کو وصول کر سکتا ہے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام پر جب یہ وحی اترتی تھی تو یہ آپ کے ذہن میں نقش ہو جاتی تھی اور نقش ہونے کے بعد

آپ ﷺ اس کو Reproduce (ہو بہو نقل) کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کلام کو صادر فرمایا، ہو بہو اسی طرح جبرئیل علیہ السلام نے پہنچایا اور ہو بہو اسی طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی کو تلاوت فرمایا۔ الفاظ وہی، حروف وہی، لہجہ وہی، ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی کہ اوپر سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کلام آیا۔ نبی علیہ السلام نے جیسے اس کو سکھایا صحابہ کو تو صحابہ نے اس کو محفوظ کر لیا اور وہ کلام آج چودہ سو سال سے زیادہ گزر گئے اسی طرح دنیا میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ چونکہ یہ کلامِ خداوندی تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی خود ذمہ داری لی ہے۔

قرآن کی حفاظت کرنے والی فوج:

اب دیکھیں اگر کوئی بادشاہ یہ کمٹمنٹ کرے کہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری میرے اوپر ہے، میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں تو خود تو نہیں جا کر چاروں طرف پہرا دے سکتا۔ اس کے لیے وہ ایک فوج تیار کرتا ہے، فوجی کا سٹیٹس اچھا ہوتا ہے، تنخواہیں اچھی ہوتی ہیں، غذا اچھی ہوتی ہے، چن چن کر لوگ فوج میں رکھے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کا آئی کیو اچھا ہو، پرسنیلٹی اچھی ہو، حاضر دماغ ہو، اچھی تعلیم ہو، اچھا فیملی بیک گراؤنڈ ہو ان کو رکھا جاتا ہے۔ اور پھر ان کو اس کام پر لگایا جاتا ہے کہ جی آپ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ تو حفاظت تو فوج کرتی ہے مگر بادشاہ کہتا ہے کہ دیکھو میں نے اس کے ذریعے سے اپنے اس کام کو کر دکھایا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ کام یوں کیا کہ اپنے بندوں میں سے کچھ ایسے بندے چنے جن کے دلوں میں قرآن مجید کی محبت ڈال دی، اپنی محبت ڈال دی۔ اب ان کے اندر ایک چاہت ہوتی ہے، ایک شوق ہوتا ہے کہ میں قرآن پاک کا حافظ بنوں۔ کسی کا دل چاہتا ہے میں بیٹے کو حافظ بناؤں، کسی کا دل چاہتا ہے کہ میں بیٹی کو حافظہ بناؤں، یہ خواہش

دل میں پیدا ہو جانا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ چنانچہ کتنے لوگ ہیں جو اپنے بچوں کو حافظ بناتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو خود حافظ بن گئے۔

فوٹوگرافک میموری:

پھر اللہ تعالیٰ ان کو فوٹوگرافک میموری بھی دے دیتا ہے، چنانچہ وہ قرآن مجید کو یاد کر لیتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کا یاد ہو جانا ایک معجزہ ہے۔ جتنا قرآن مجید کا والیم ہے اتنی اگر دنیا کی کسی زبان کی کتاب ہو تو اس کتاب کو کوئی بندہ یاد نہیں کر سکتا۔ بلکہ عام طور پر دیکھا گیا کہ آپ اگر ایک دفعہ کتاب کو پڑھیں تو Enterest (دلچسپی) رہے گا۔ دوسری دفعہ پڑھیں Enterest (دلچسپی) کم ہو جائے گا۔ تیسری دفعہ اور کم، چار پانچ دفعہ کے بعد کتاب دیکھنے کو دل نہیں کرے گا۔ قرآن مجید کا معاملہ اور ہے، اسے ایک دفعہ پڑھیں دل متوجہ ہوتا ہے، دوسری دفعہ پڑھیں اور زیادہ متوجہ ہوتا ہے، تیسری دفعہ اور زیادہ، جتنا زیادہ انسان قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اتنا قرآن مجید کے ساتھ اس کی Attachement (تعلق) بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ساری زندگی اس کو پڑھتے رہتے ہیں، اس کی لذت بڑھتی رہتی ہے کم نہیں ہوتی۔ جیسے پیاسا بندہ سخت گرمی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ملے تو کتنے شوق سے پیتا ہے؟ بالکل اسی طرح قرآن مجید سے محبت رکھنے والا بندہ اللہ تعالیٰ کے اس قرآن کو اسی شوق کے ساتھ پڑھتا ہے۔ عمریں گزر جاتی ہیں دل نہیں بھرتا، زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں قرآن مجید کی وہ لذت ختم نہیں ہوتی، جب دیکھو ایک نئی لذت ہوتی ہے، ایک نیا سرور ہوتا ہے۔

دس بندوں کی شفاعت کا حق:

تو اللہ رب العزت نے اس کی حفاظت اپنے بندوں سے لی۔ اسی لیے یہ جو

قرآن مجید کے حافظ بندے ہوتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ہیں، جیسے فوجی Selected (چنا ہوا) بندہ ہوتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے چنیدا بندے ہوتے ہیں، ان کو اللہ نے چن لیا ہوتا ہے۔ اسی لیے قیامت کے دن ان کے والدین کے سروں پر نور کے تاج رکھے جائیں گے اور ان حافظوں کو کہا جائے گا کہ کم از کم دس بندوں کو جن پر جہنم واجب ہو چکی شفاعت کریں اور ان کو اپنے ساتھ لے کر جنت میں جائیں گے۔

شفاعت کن لوگوں کے لیے ہوگی؟

اب یہاں ایک نکتہ اور بھی سمجھنے والا ہے کہ کون سے دس بندوں کی شفاعت ہوگی۔ تو علما نے ایک بات کھولی کہ جب بھی کوئی بچہ چنیدا حافظ بنتا ہے نا۔ عام طور پر اس کے قریبی رشتہ داروں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اس کے اس کام سے خوش نہیں ہوتے، وہ اس کو Discourage (مایوس) کرتے ہیں۔ اس کو ٹانٹ کرتے ہیں کہ کیا تم مولوی بن رہے ہو؟ کیا تم مدرسے جا رہے ہو؟ کیا تم یہ کر رہے ہو؟ وہ بچے کو ڈسکریج کرتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کو بھی کہتے ہیں اس کو انجینئر بناتے، ڈاکٹر بناتے، پائلٹ بناتے، ایم بی اے پڑھاتے، یہ کرتے، وہ کرتے، تم نے کدھر ڈال دیا۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو اس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بچے کو پیار کی نظر سے دیکھتے ہیں، محبت کرتے ہیں، اس کی ہمت بڑھاتے ہیں، اس کو دعائیں دیتے ہیں، اس کو Moral Support (اخلاقی حمایت) دیتے ہیں۔

لہٰذا قیامت کے دن وہ تمام لوگ جو اس بچے کو Discourage (حوصلہ شکنی) کرتے تھے وہ اپنے آپ کو اس کی شفاعت کے حق سے محروم کر لیں گے۔ بچے کی شفاعت ان گناہ گاروں کے بارے میں ہوگی جو بچے کو سپورٹ کرتے تھے، اس کے

لیے دعائیں کرتے تھے، اس کو کہا کرتے تھے، تم اچھا کام کر رہے ہو۔ ان میں سے اگر کوئی بندے جہنم میں جانے والے ہوں گے، یہ بچہ ان کی شفاعت کر کے ان کو جنت میں لے جائے گا۔ اس لیے جب بھی دیکھیں کہ کوئی بچہ حافظ بن رہا ہے، ہمیشہ اس کی سپورٹ کریں کہ بھئی! میں ایک کام نہیں کر سکا یہ کر رہا تو میں کوئی خیر کا کلمہ تو کہہ دوں۔ میں کم از کم یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ بچے تم بہت اچھا کام کر رہے ہو، اللہ تمہیں خوش رکھے، اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی کرے۔ دو بول بولیں گے، بچے کا دل خوش ہو جائے گا۔

تو ایک تو یہ اصول بنالیں کہ ہمیشہ جب بھی پتہ چلے کہ کوئی بچہ حافظ بن رہا ہے، کوئی بچی حافظ بن رہی ہے، ہمیشہ اس کو مارل سپورٹ کریں۔ کیا پتہ ہمارا یہی عمل قیامت کے دن ہماری بخشش کا سبب بن جائے۔ یا وہ لوگ جو حفظ کے مدارس کے ساتھ تعاون کر رہے ہوتے ہیں، کاروباری لوگ ہوتے ہیں، تاجر لوگ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہوتا ہے اور وہ اپنے اس مال کے ذریعے ایسے مدارس کو چلانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً وہ لوگ ہوں گے جن کے لیے قیامت کے دن قرآن پاک کی شفاعت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی ان کے اوپر رحمت کی نظر ہوگی۔

ڈیٹا محفوظ کرنے کے دو طریقے:

عام طور پر دیکھا ہے کہ آج کمپیوٹر پر کوئی کام کیا جائے تو اس کو محفوظ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہوتی ہے ہارڈ کاپی اور ایک ہوتی ہے سوفٹ کاپی۔ ہارڈ کاپی تو یہ ہوئی کہ آپ نے کمپیوٹر پر کوئی فائل لکھی پھر پرنٹر سے اس کو پرنٹ کر کے فائل میں کاغذ لگا کے رکھ لیا، یہ ہارڈ کاپی کہلاتی ہے۔ اور سوفٹ کاپی یہ ہوتی ہے کہ آپ نے جو کام کیا اس کو آپ نے ہارڈ ڈسک کے اندر یا یا سی ڈی کے اندر ٹرانسفر کر دیا، یہ سوفٹ کاپی بن گئی۔ تو عام طور پر ڈیٹا کو دو طرح سے محفوظ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ اللہ رب العزت نے بھی چودہ سو سال پہلے سے ہی قرآن مجید کو دو طرح سے محفوظ کروایا۔ ایک قرآن مجید کی ہارڈ کاپی اور ایک سافٹ کاپی۔

قرآن پاک کی سوفٹ کاپیز

چنانچہ آپ ﷺ کا قلب مبارک قرآن مجید کی سوفٹ کاپی تھی اور امت میں صحابہ کرام نے جو قرآن مجید کو حفظ کیا، حافظوں کے دل اور حافظات کے دل اللہ تعالیٰ کے قرآن کی سوفٹ کاپی ہیں۔ یہ ڈسکس ہیں، یہ سی ڈیز ہیں جن کے اوپر اللہ کا کلام محفوظ ہوتا ہے۔ یہ چلتے پھرتے جہاں چاہتے ہیں کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ! ڈیٹا Retrieve (ظاہر) ہو جاتا ہے۔ اللہ کی یہ شان ہوتی ہے۔

صحابۂ کرام کا شوقِ قرآن:

چنانچہ نبی علیہ السلام قرآن مجید کے سب سے پہلے حافظ تھے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حفظ کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بہت سی تعداد ایسی تھی جنہوں نے قرآن مجید کو مکمل حفظ کیا اور کچھ حصہ تو سب صحابہ کو یاد تھا۔ اس لیے وہ رات کی تنہائیوں میں قرآن مجید کو پڑھا کرتے تھے۔ انہیں مزہ آتا تھا، لطف آتا تھا۔

﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ﴾ (المائدۃ:۸۳)

قرآن سنتے تھے آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے، یہ قرآن ان کے دلوں کو گدگدا دیتا تھا۔ ان کے دل کے تار چھیڑ دیتا تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ ہم قرآن مجید کو پڑھتے ہی رہیں۔ جیسے بچے کے منہ سے فیڈر نکالیں تو اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ روتا ہے، جھنجھلاتا ہے، چلاتا ہے، کیوں فیڈر نکالا؟ ایسے ہی ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ہم قرآن پڑھنا روک دیں یا چھوڑ دیں۔ چنانچہ تیر لگ رہے ہیں، سورۃ کہف پڑھ رہے ہیں اور کہہ

رہے ہیں کہ مجھے اگر فرضِ منصبی میں کمی کو خوف نہ ہوتا میں تیروں پہ تیر تو کھاتا رہتا سورۃ کہف کو مکمل پڑھے بغیر سلام نہ پھیرتا۔ اتنا ان کو مزہ اور لطف آتا تھا۔

چنانچہ صحابہ کرام میں قرآن مجید کے حفاظ موجود تھے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ حافظ تھے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ حافظ تھے۔ کیسے حافظ تھے؟ سبحان اللہ ایک مرتبہ بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو یہ خاموش ہو گئے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قرآن پڑھو! اے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قرآن پاک آپ پر اتارا گیا، میں آپ کے سامنے پڑھوں؟ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں پڑھو! تو ان کو Feel (احساس) ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی علیہ السلام کو اشارہ ہوا ہے۔ تو جیسے ہی انہیں محسوس ہوا تو انہوں نے آگے سے پوچھا: اے اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم!

((آللّٰهُ سَمَّانِیْ))

کیا اللہ نے میرا نام لے کر کہا ہے؟

تو نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((نَعَمْ اَللّٰهُ سَمَّاكَ)) (البخاری، رقم ۴۵۷۸)

اللہ ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لے کر کہا

کہ ابن کعب سے کہو کہ قرآن سنائے۔ محبوب! آپ بھی سنیں گے اور میں پروردگار بھی سنوں گا۔ کیسا وہ قرآن پڑھتے ہوں گے!

اسی حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب کوئی گانے والی مغنیہ گانا گاتی ہے تو جتنے شوق سے لوگ اس کے گانے کو سنتے ہیں، اس سے زیادہ توجہ اور محبت کے ساتھ اللہ رب العزت اپنے قرآن پڑھنے والے بندے کا قرآن سن رہے ہوتے ہیں۔

فرشتوں کا شوقِ تلاوت:

جب حافظِ قرآن پڑھتا ہے، تو فرشتے اس کی طرف دوڑ کے آتے ہیں۔ حضرت

جبرئیل علیہ السلام فرشتوں میں سے وہ ہستی ہیں جن کو قرآن مجید پڑھنے کی اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمائی۔ باقی فرشتے قرآن پڑھ نہیں سکتے یہ فقط انسانوں کی تلاوت سن سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک بندہ جو خود پڑھ نہ سکتا ہو تو جب اسے سنتا ہے تو اس کو زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ جیسے ہی کوئی قرآن مجید پڑھنا شروع کرتا ہے تو اللہ کے فرشتے اس کے اوپر آتے ہیں حتیٰ کہ اس کے اوپر تانتا بندھ جاتا ہے، آسمان تک ان کا سلسلہ لگ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام سننے کے لیے آجاتے ہیں، حتیٰ کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ وہ قریب ہوتے ہوتے اس حافظِ قرآن کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ اس کے لبوں پہ منہ پر برکت کے لیے اپنا منہ رکھ دیتے ہیں۔ یعنی فرشتے بھی اس کے منہ کو بوسے دیتے ہیں کہ اس منہ سے قرآن نکل رہا ہے، اللہ کا کلام نکل رہا ہے۔

چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں قرآن پڑھ رہے ہیں، چھوٹا سا صحن ہے، چارپائی ہے، بیٹا لیٹا ہوا ہے، قریب گھوڑا بندھا ہوا ہے، طبیعت مچل رہی ہے، دل چاہتا ہے کہ ذرا میں بلند آواز میں جہر سے قرآن پڑھوں لیکن جب یہ ذرا جہر سے قرآن پڑھتے ہیں، تو گھوڑا بدکتا ہے اور یہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ میرے بچے کو نقصان نہ پہنچا دے، لات ہی نہ مار دے بچے کو تو یہ آہستہ پڑھتے ہیں، پھر طبیعت مچلتی ہے، پھر اونچا پڑھتے ہیں پھر گھوڑا بدکتا ہے، پھر آہستہ پڑھتے ہیں۔ ساری رات اسی کاروائی میں گزر گئی۔ جب انھوں نے سلام پھیرا تو آسمان کی طرف دیکھا تو انہیں کچھ روشنیاں نظر آئیں جوان کے سر سے دور پیچھے آسمانوں کی طرف واپس جا رہی تھی۔ ان روشنیوں کو دیکھ کر حیران ہوئے، صبح نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! رات میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: جن کو تم نے روشنیوں کی شکل میں دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے تھے،

تمہارا قرآن سننے کے لیے آسمان سے اتر آئے تھے۔ اگر تم قرآن پڑھتے رہتے آج مدینہ کے لوگ اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو دیکھ لیتے۔ تو یہ قرآن مجید ایسی نعمت ہے'' اللہ اکبر''

امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے منہ کی خوشبو:

قرآن مجید کے ایک قاری گزرے ہیں امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ ان کے منہ سے بہت خوشبو آتی تھی۔ مشک وعنبر کی بھی اتنی خوشبو نہیں ہوتی ہوگی جوان کے منہ سے آتی تھی۔ سب لوگ بڑے حیران ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا: حضرت! آپ کون سی خوشبو منہ میں رکھتے ہیں؟ ایسی خوشبو تو کبھی سونگنے میں نہیں آتی، بندہ حیران ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کہ واللہ میں تو کوئی خوشبو منہ میں نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا: مگر حضرت اتنی خوشبو کیسے آتی ہے؟ فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے خواب میں نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی تو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ عاصم تم قرآن اتنا شوق سے پڑھتے ہو، زندگی اسی میں لگا دی ہے، آؤ میں تمہارے لبوں کو بوسہ دوں۔ خواب میں نبی علیہ السلام نے میرے لبوں کو جب سے بوسہ دیا اس وقت سے میرے منہ میں خوشبو آرہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فوج کو حکم:

یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی سافٹ کاپیز تمام حفاظ ہیں، مرد ہوں یا عورتیں ہوں، بچے ہوں یا بچیاں ہوں، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو دلوں کے اندر محفوظ کر لیا۔ تو یہ قرآن مجید کا معجزہ ہے کہ اس کو یاد کر لینا بھی اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا۔ اسی لیے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مستقل ایک آرڈر دیا تھا اپنے ایک امیر لشکر کو کہ جب تمہاری ایکٹیوٹی ذرا Slow (کم) ہو جائیں یعنی معمول پر آجائیں تو تم اپنے فوجیوں کو کہو کہ وہ اللہ کے کلام کو یاد کریں۔ چنانچہ ہزاروں صحابہ اس آرڈر کے بعد پورے

قرآن مجید کے حافظ بنے۔ تو یہ سلسلہ وہاں سے آگے چلا، پھر تابعین بنے، تبع تابعین بنے، یہ سلسلہ اوپر والوں سے نیچے چلتا چلا آیا، آج بھی شاگرد اپنے استادوں سے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں اور پوری دنیا میں الحمدللہ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں۔

بچوں کی مدتِ حفظ:

عام طور پر ایک بچہ دو سال سے تین سال کی مدت میں قرآن مجید حفظ کر لیتا ہے۔ Average (متوسط) بچہ اتنا ٹائم لیتا ہے۔ اگر اچھا ٹائم دے شوق و ذوق ہو تو کوئی دو سال میں کر لیتا ہے کوئی تین سال میں کر لیتا ہے، کوئی دو سے بھی کم میں کر لیتا ہے۔ ایسے بھی بچے ہوتے ہیں جو ڈیڑھ سال میں حافظ بن جاتے ہیں، کچھ ایک سال میں حافظ بن جاتے ہیں۔ وہ بچے بھی ہوتے ہیں جو ایک سال سے بھی کم میں حافظ بن جاتے ہیں۔

سات مہینے میں حفظ:

چنانچہ ہمارے بچیوں کے جامعہ میں داخلہ لینے کے لیے ایک لڑکی آئی اور وہ ڈبل ایم اے تھی۔ ایم اے جغرافیہ اور ایم اے کیلیگرافی، ڈبل ایم اے کیا ہوا تھا۔ کہنے لگی کہ حافظہ بننا ہے تو جو منتظمہ تھی انہوں نے ان سے کہا: حفظ کی بچیاں تو چھوٹی عمر کی ہوتی ہیں۔ آپ اکیلی بڑی عمر کی بچی عجیب محسوس کرو گی تو بہتر یہ ہے کہ آپ بخاری شریف پڑھنے والی جو عالمات فاضلات کی کلاس ہے، اس میں داخلہ لیں۔ وہ کہنے لگی کہ جی میں بعد میں داخلہ لے لوں گی۔ دل میں حفظ کا بہت شوق ہے میں پہلے حافظہ بننا چاہتی ہوں۔ اس کے شوق کو دیکھ کر انہوں نے داخلہ دے دیا۔ سات مہینے کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ جو ایک بچی آئی تھی، ڈبل ایم اے، آج سات مہینے گزرے

اور اس نے قرآن مجید کو مکمل حفظ کر لیا ہے۔ اللہ کی شان سات مہینے سے بھی کم میں واقعات موجود ہیں۔ بعضوں نے چار مہینے میں کر لیا، بعضوں نے تین مہینے میں بھی کر لیا۔

ایک مہینے میں حفظ:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حج پر تشریف لے گئے آپ کے ساتھ بہت سے علما اور طلبا تھے لیکن اللہ کی شان ان میں پورا حافظ قرآن کوئی بھی نہیں تھا۔ ادھر سے رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا، حضرت نے فرمایا کہ بھئی! یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ اتنے بڑے بڑے علما ہوں اور وہ آخری سورتوں کے ساتھ قرآن پڑھ رہے ہوں۔ چنانچہ حضرت کیا کرتے کہ روزانہ دن میں ایک ایک پارہ یاد کر لیتے اور رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ ادھر رمضان مکمل ہوا، ادھر ان کا قرآن مکمل ہو گیا۔ ۳۰ دن میں قرآن مجید یاد کر لیا۔

ایک ہفتے میں حفظ:

تیس سے بھی کم دنوں میں حفظ کرنے کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ ایک بڑے باپ کے نواب کے بیٹے تھے، بہت خوبصورت تھے، ذہین تھے، جب ان کے والد ان کو لے کر آئے کہ جی میرے اس بچے کو آپ علم پڑھانے کے لیے قبول فرمائیں۔ حضرت نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیا۔ پوچھا کہ بچہ کیا قرآن مجید کے حافظ ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں، تو امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرے ہاں علم پڑھنے کے لیے حافظ ہونا شرط ہے۔ یہ Prequalification (تعلیمی اہلیت) ہے میرا شاگرد بننے کے لیے۔ لہٰذا قرآن پاک کو حفظ کر کے پھر آنا۔ تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ چلے گئے۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے

بعد دوبارہ آگئے، حضرت! اپنا شاگرد بنالیجیے۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں کہا تھا کہ حفظ کر کے آنا۔ کہا کہ حضرت میں قرآن مجید حفظ کر کے ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔ سبحان اللہ، ایک ہفتہ میں قرآن مجید حفظ مکمل کرلیا۔

تین دنوں میں حفظ:

اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی ایک کتاب ہے ''تراشے''۔ اس میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ چند بڑے بڑے علما بیٹھے ہوئے تھے۔ تذکرہ چھڑ گیا کہ فلاں عالم بھی ہے حافظ بھی ہے، فلاں فقط عالم ہے، تو ان میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام تھا ہشام کلبی، اس کے بارے میں کہا کہ یہ عالم تو بہت بھاری ہے مگر حافظ نہیں ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اچھا مجھے مکمل حافظ ہونا چاہیے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے حفظ کا ارادہ کرلیا اور تیسرے دن میں پورے قرآن مجید کا حافظ بن چکا تھا۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں۔

اب دیکھیے کہ اتنی بڑی کتاب صرف تین دن میں حفظ، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ادھر سے کمانڈ گئی اور ڈیٹا ٹرانسفر ہونے میں چند سیکنڈ لگ جاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا ہی سلسلہ بنا، اللہ نے پورے قرآن کو ٹرانسفر ہی کر دیا۔

کم عمری میں حفظِ قرآن کی مثالیں:

اچھا یہ بھی عجیب بات ہے کہ مختلف عمر کے لوگوں سے قرآن مجید حفظ کیا۔ یہ نہیں ہے کہ صرف بچوں نے کیا یا جوانوں نے کیا یا بوڑھوں نے کیا، نہیں ہر عمر کے بندے نے قرآن حفظ کیا۔ چنانچہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ نوجوان حافظ بنے۔ کوئی بیس سال میں بنا، کوئی تیس سال میں، کوئی چالیس سال میں، کوئی پچاس میں۔ مگر چھوٹی عمر کی بھی مثالیں ہیں: ہمارے ہاں عام طور پر بچے دس سال گیارہ سال کی عمر میں قرآن

مجید کے مکمل حافظ بن جاتے ہیں۔ بہترین عمر یہی ہوتی ہے۔ بچے کو پہلی پانچ کلاسیں سکول کی پڑھائی جائیں تاکہ اس کے اندر تھوڑی سمجھ بوجھ آجائے اور پھر اس کو قرآن مجید کا حافظ بنایا جائے۔ تو وہ بچہ ڈیڑھ سال میں دو سال میں قرآن مجید کا مکمل حافظ بن جاتا ہے۔ کئی جگہوں میں ترتیب یہ ہے کہ سکول کی تعلیم کے ساتھ ہی حافظ بنا دیتے ہیں۔ جیسے بھی ترتیب ہو بہر حال یہ بہترین عمر ہوتی ہے قرآن مجید یاد کرنے کی۔ سات سال کی عمر میں بھی بچے قرآن حفظ کر لیتے ہیں۔ پچھلے سال اجتماع پر ایک حافظہ بچی نے پڑھا، اس کی عمر سات سال پوری بھی نہیں تھی، پونے سات سال عمر تھی۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ جب ہم نے اس کو میز پہ کھڑا کیا تو ہمارے بعض پٹھان بھائی کہنے لگے کہ یہ گڑیا قرآن مجید پڑھنے والی کہاں سے آگئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ کوئی پلاسٹک کی گڑیا قرآن مجید پڑھ رہی ہے۔ اتنی چھوٹی بچی تھی اور وہ حافظہ بن گئی۔

اس سے بھی کم عمر کی مثالیں موجود ہیں۔ ہارون الرشید کے دور میں ایک بچے کو اس کے والد لے کر آئے جس بچے کی عمر پانچ سال تھی اور وہ قرآن مجید کا حافظ تھا۔ اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب والد نے کہا کہ بیٹا قرآن پڑھو! تو وہ ضد کرنے لگا کہ ابو! میرے ساتھ وعدہ کریں کہ گڑ کی ڈلی لے کر دیں گے تو میں قرآن پڑھوں گا۔ اس زمانے کی چنگم کینڈی یہی کچھ ہوتا تھا، گڑ ہوتا تھا، اس نے کہا کہ ابو وعدہ کریں۔ اس نے کہا: ہاں بیٹے! میں گڑ لے کر دوں گا۔ تو اس وقت اس نے پڑھنا شروع کیا۔ ہارون الرشید خود بھی حافظ تھا، اس نے مختلف جگہوں سے اس سے قرآن پاک سنا، اللہ کی شان بچے نے ہر جگہ سے صحیح قرآن پاک سنا دیا۔ تو پانچ سال کی عمر میں بھی بچے حافظ بن جاتے ہیں۔

بڑی عمر میں حفظِ قرآن:

بڑی عمر کو دیکھیں، تو ماشاء اللہ! پکی عمر میں بھی لوگ حافظ بنے، کوئی پچاس سال

میں بنا، کوئی ساٹھ میں بنا۔ ہمارے اپنے تعلق والے ایک صاحب ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ جب قرآن مجید مکمل کیا تو مجھے حکم دیا کہ جی آپ نے دستار بندی کے لیے آنا ہے۔ حاضر ہو گیا۔ اللہ کی شان کہ جب ان کی دستار بندی کا وقت آیا تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے سر کے بال کے بھی سفید تھے، داڑھی کے بھی سفید تھے، مونچھوں کے بال بھی سفید تھے اور بھنوؤں اور پلکوں کے بال اور یہ جو کلائیوں پر بازو بال ہوتے ہیں یہ بھی سفید تھے۔ ان کے پورے جسم پر کوئی کالا بال نظر نہ آتا تھا۔ شاید نوے کے قریب ان کی عمر تھی، اس عمر میں اللہ نے اس کو قرآن کا حافظ بنا دیا۔ تو پانچ سال کی مثالیں بھی موجود اور نوے سال کی مثالیں بھی موجود ''اللہ اکبر کبیرا''۔

مستورات میں حفظِ قرآن:

اور یہ کام جیسے مردوں نے کیا، ایسے عورتوں نے بھی کیا۔ اللہ کی وہ نیک بندیاں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو بھرا وہ بھی قرآن پاک کی حافظہ بنیں سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا سیدنا حفصہ رضی اللہ عنہا یہ قرآن مجید کی پہلی مکمل حافظہ تھیں۔ امہات المؤمنین میں سے پھر اس کے بعد اور صحابیات بھی بنتی گئیں، یہ سلسلہ مستورات میں بھی چلا۔ الحمد للہ اس وقت بھی بنات کے ان گنت مدارس ہیں جہاں بچیاں اللہ کے قرآن کی حافظات بن رہی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ ایک بھائی اور ایک بہن ایک ہی وقت میں قرآن حفظ کرنا شروع کریں تو بھائی کی نسبت بہن پہلے کر لیتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچیوں میں Concentration (یکسوئی) زیادہ ہوتی اور بچوں کے اندر Frestation (انتشار) زیادہ ہوتی ہے، یہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جبکہ بچیاں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں اسی لیے عام طور پر حفظ میں بچیاں بچوں سے زیادہ آگے نکل جاتی ہیں۔ چنانچہ اس امت میں جس طرح قراء گزرے ہیں اسی طرح قاریات بھی گزریں۔

حفصہ بنت سیرین کا شوقِ قرآن:

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے خواب کی تعبیر کا علم دیا تھا۔ محمد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ ان کی ایک کتاب تعبیر الرؤیا بہت معروف ہے۔ ان کی ایک بہن تھی حفصہ بنت سیرین رحمۃ اللہ علیہا یہ تابعین میں سے تھیں۔ تو حفصہ بنت سیرین قرآن پاک کی حافظہ بھی تھیں قاریہ بھی تھیں۔ قرآن پاک کی انہوں نے پینتیس سال خدمت کی، وہ کیسے کہ اپنے گھر کے اندر انہوں نے چھوٹی سی مسجد بنائی ہوئی تھی جس کو مسجدِ بیت کہتے ہیں۔ وہ اعتکاف کی نیت سے پینتیس سال وہاں رہی فقط ضرورت کے لیے مسجد سے باہر آتی تھی ورنہ وہی رہتی تھیں۔ بچے بچیوں اور عورتوں کو اللہ کا قرآن سکھاتی تھی اور جب فارغ ہوتی تھی تو اپنا وقت اللہ کی عبادت میں گزار دیا کرتی تھی۔ چنانچہ ایاس بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ تابعین میں تمہاری نظر میں سب سے افضل کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ میری نظر میں حفصہ بنت سیریں رحمۃ اللہ علیہا تو پوچھنے والے نے کہا کہ کیا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو فضیلت دے رہے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں حفصہ میں وہ خوبیاں دیکھتا ہوں کہ میں ان کو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر بھی فضیلت دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ وہ کس درجے کی حافظہ قاریہ اور نیک خاتون تھی۔ کئی مرتبہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ قرآن مجید پڑھتے ہوئے کسی لفظ کی ادائیگی میں تھوڑا متردد ہوتے تو بچے کو بھیجتے تھے کہ جاؤ اور میری بہن حفصہ سے پوچھ کر آؤ کہ یہ لفظ کیسے پڑھنا ہے اور جیسے وہ پڑھتی تھی اسی طرح محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ پڑھا کرتے تھے۔

ان کے بارے میں آتا ہے کہ رات ہوتی تھی اور عشا کے بعد دو رکعت کی نیت باندھتی تھیں اور پوری رات اللہ کا قرآن پڑھنے میں گزار دیتی تھیں۔ ان کی ایک باندی تھی، وہ عقل کی پوری کی پوری تھی۔ ایک دن ہمسائے کے گھر گئی تو ہمسائیوں نے

پوچھا کہ بتاؤ تمہاری مالکہ کا کیا حال ہے؟ تو وہ بیچاری بات تو پوری سمجھتی نہیں تھی، کہنے لگی کہ ٹھیک ہے۔ پوچھا کہ سناؤ! کیسے اس کے دن رات گزرتے ہیں؟ کہنے لگی کہ پتہ نہیں بیس سال مجھے ان کی خدمت کرتے ہو گئے ہیں روز دیکھتی ہوں عشاء کا وقت ہوتا ہے تو وہ دو رکعت نیت باندھ لیتی ہیں اور رونا شروع کر دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آخر ان سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا کہ بیس سال رونے کے بعد بھی معاف نہیں ہوا۔ تو ایسی بھی اللہ کی نیک بندیاں تھی کہ بیس بیس سال ان کی راتیں اللہ تعالیٰ کے قرآن کی تلاوت میں گزر گئی۔ تو جیسے مردوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اسی طرح عورتوں نے بھی قرآن مجید کو حفظ کیا۔ تو یہ قرآن مجید کی سوفٹ کاپی ہیں۔

ضبطِ حفظ کی عجیب و غریب مثالیں:

بعض لوگوں کے اندر ایسی بات ہوتی ہے کہ واقعی قرآن مجید کو انہوں نے صحیح معنوں میں ضبط کیا ہوتا ہے۔

⊙...... چنانچہ ہم ایک مرتبہ رمضان مبارک میں مری گئے تو وہاں پر ایک جگہ ایک قرأت کانفرنس ہوتی ہے۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ یہاں ایک ایسا مصلیٰ ہے، چھتیس سال سے وہاں تراویح پڑھائی جا رہی ہیں، چھتیس سال میں ایک مرتبہ بھی امام کو وہاں لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حافظ ہی ایسے کھڑے کیے جاتے ہیں کہ جن حفاظ کو پیچھے سے لقمہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، ایسا قرآن مجید یاد ہوتا ہے۔

⊙...... چنانچہ حضرت قاری فتح محمد رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے، ایک شاگرد آیا انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ بھئی تمہیں قرآن مجید صحیح یاد ہے یا نہیں؟ وہ کہنے لگا: حضرت! یاد تو بہت اچھا ہے البتہ جہاں وقف آتا ہے وہاں آخری لفظ پر کہیں کہیں متشابہ لگ جاتا ہے۔ جیسے ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ ہے یا بَصِيْرًا۔ یا کہیں پر تَعْمَلُوْنَ ہے یا يَعْمَلُوْنَ آخری لفظ کے اوپر مجھے متشابہ لگ جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا: اچھا! میں

تمہیں سناؤں کہ ہر آیت کا آخری لفظ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ سنائیں۔ تو حضرت نے فقط آخری آخری لفظ پڑھنا شروع کر دیا مثلاً اَلْعٰلَمِیْنَ...... ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اَلرَّحِیْم﴾...... اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ایک ایک حرف پڑھتے پڑھتے الم سے شروع کر کے والناس تک پورا قرآن شریف ختم کر دیا۔ ایسے لگتا ہے جیسے سکرین پر ان کے سامنے قرآن پاک لکھا ہوا ہے وہ آنکھوں سے دیکھ کے پڑھتے جا رہے ہیں۔ ایسے بھی قرآن مجید کے حافظ موجود ہیں۔

⊙...... چنانچہ ہمارے ایک تعلق والے دوست ہیں، عالم ہیں، ان کی والدہ ہمارے ساتھ حج میں تھیں۔ وہ قرآن مجید کی عاشقہ ہیں، بوڑھی عورت ہیں، مگر اللہ نے ان کے دل میں قرآن مجید کی عجیب محبت بھری ہے۔ اتنی پکی حافظہ ہیں کہ ان کو حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ قرآن مجید بھولتے کیسے ہیں؟ وہ اس پر ایک مرتبہ حیران ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں کہ اچھا! قرآن مجید بھولتے ہیں؟ یہ ان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ قرآن مجید میں بھول کیسے ہو جاتی ہے؟ اتنی قرآن مجید کی اتنی پکی حافظہ ہیں۔

⊙...... ہمیں ایک مرتبہ ایک صاحب سے ملنے کا موقعہ ملا، ایک تقریب تھی، نکاح تھا، اس میں اکٹھے ہوئے تو کسی نے کہا کہ جی یہ قاری صاحب ہیں، قرآن مجید کے کمپیوٹر ہیں۔ مجھے عجیب سی بات لگی کہ پتہ نہیں کہ لوگوں کے دماغوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر بات میں کمپیوٹر کا لفظ ضرور گھسا دیتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ پکے حافظ ہیں، بڑے قاری ہیں، یہ کیا جی قرآن مجید کے کمپیوٹر ہیں۔ خیر جب محفل ختم ہوئی تو ان کے قریب محفل کے پندرہ بیس حفاظ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بھی پہلا موقعہ تھا ان کے ساتھ، چنانچہ ہم بھی قریب آ گئے اور پھر ہم نے واقع ہی محسوس کیا کہ وہ قرآن مجید کے کمپیوٹر تھے۔ وہ کیسے؟ حفاظ جب عام طور پر ایک دوسرے سے کچھ پوچھنا ہوتا ہے تو یہ پوچھتے ہیں اچھا بھئی فــــکیف اس لفظ سے آگے آیت پڑھو! اب کیف تو کتنی جگہوں پر آ گیا۔

فتکون سے آگے پڑھو! تو پھر آیت آگے پڑھنی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کا ٹیسٹ لیتے ہیں۔ تو یہ تو آسان ٹیسٹ ہے، اکثر لوگ لے لیتے ہیں۔ فتکون سے مختلف آیتیں پڑھ لیتے ہیں مگر وہاں تو معاملہ کچھ اور تھا۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ اچھا جی فتکون کا لفظ کہاں ہے؟ انہوں نے آیت نہیں پڑھی۔ قاری صاحب نے فتکون کا لفظ سنتے ہی کہنے لگے: فلاں پارے فلاں سورۃ کی فلاں نمبر آیت کے اندر ہے، پھر فلاں پارے فلاں سورۃ کی فلاں آیت کے اندر ہے، وہ آیتوں کے نمبر بھی بتا رہے تھے۔ اچھا چند لوگوں کے پاس قرآن پاک تھے، وہ اس کو دیکھ تصدیق کر رہے تھے کہ واقعی جو آیات کا نمبر وہ بتا رہے تھے اسی آیت میں وہ لفظ موجود ہوتا تھا میں نے کہا یا اللہ قرآن مجید کے حافظ تو بڑے بندے دیکھے تھے ایسا بندہ تو نہیں دیکھا کہ جس کو آیتوں کے نمبر تک بھی یاد تھے تو پڑھنے والے عاشقوں نے قرآن مجید کو ایسے بھی یاد کیا۔

کثرتِ تلاوت کی مثالیں:

اچھا جس طرح قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کیا گیا کہ بغیر غلطی کے پڑھنے والے حفاظ بنے۔ اسی طرح کثرت سے تلاوت کرنے والے بھی بہت تھے، چنانچہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ قرآن مجید بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کی شہادت بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے ہوئی۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بہت کثرت سے قرآن مجید پڑھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان المبارک میں ایک پارہ دن میں پڑھتے، اور ایک پارہ رات میں پڑھتے، یہ ہوئے ساٹھ سیپارے اور تین پارے تراویح میں پڑھتے تھے۔ ہر رمضان المبارک میں تریسٹھ مرتبہ قرآن مجید مکمل پڑھا کرتے تھے۔ اتنا کثرت سے پڑھنے والے تھے۔ تو پڑھنے والوں نے اس کو خوب پڑھا ہے۔

قرآن کا فیض نسل در نسل:

بھئی یہ عشاق کا قافلہ ہے۔ اصل میں یہ حفاظ عشاق کی ایک جماعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عاشق، اللہ تعالیٰ کے قرآن کے عاشق۔ اس میں عجیب وغریب قرآن کے عاشق ہیں، چنانچہ یہی لاہور کی بات ہے، ایک عالم تھے، انہوں نے ناشتے میں بلایا۔ کہنے لگے کہ حضرت! میرے والد قرآن مجید کے عاشق تھے۔ ہم نے کہا: بھئی! ہمیں بھی کچھ واقعات سناؤ! کہنے لگے کہ جی ایک مرتبہ کسی نے انہیں بتایا کہ اگر آپ دو سال روزانہ ایک قرآن مجید پڑھتے رہیں تو قرآن مجید کا فیض آپ کی آنے والی Generation (نسل) کے اندر جاری ہو جائے گا۔ کہنے لگے کہ میرے والد صاحب نے پڑھنا شروع کر دیا، روز ایک قرآن مجید مکمل پڑھ لیتے، سردی بھی، گرمی بھی، صحت بھی، بیماری بھی، خوشی بھی، غمی بھی، دیس بھی، پردیس بھی، کتنے مختلف حالات ہوتے ہیں مگر انہوں پورے دو سال روزانہ ایک قرآن مجید مکمل کیا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں قرآن مجید اس طرح جاری کیا کہ آج میرے والد کے جتنے بیٹے اور جتنی بیٹیاں اور ان کے آگے جتنے بیٹے جتنی بیٹیاں سات سال سے اوپر کی عمر کے ہیں سب کے سب قرآن مجید کے حافظ ہیں۔ میرے والد کی نسل سے کوئی بچہ بچی ایسی نہیں جو سات سال سے اوپر ہو اور وہ قرآن پاک کا حافظ نہ ہو۔

ایک سوال کا امتحان:

ایک مرتبہ ہم سرحد کی طرف گئے تو وہاں ایک مدرسہ ہے جس میں گردان حفظ کو پکا کرنے والی بہت اچھی کرواتے ہیں۔ ہمارے اپنے تعلق والے ہیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ بتائیں آپ کا طریقہ کار کیا ہے؟ انہوں نے تفصیل بتائی کہ ہم بچوں کو اس وقت سلاتے ہیں، اس وقت جگاتے ہیں، یہ کھلاتے ہیں، یہ سمجھاتے ہیں، ساری

انہوں نے ترتیب بتائی۔ جب میں نے سب سن لیا تو میں نے کہا کہ جی آپ پھر ان کا امتحان کیسے لیتے ہیں؟ کہنے لگے: بس ایک سوال پوچھتے ہیں، میں حیران ہوا کہ قرآن مجید کا حافظ بن کے امتحان دینا ہے اور ایک ہی سوال پوچھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا سوال پوچھتے ہیں؟ کہنے لگے کہ جی چار پانچ حفاظ اس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں ہر ایک کے پاس قلم اور کاغذ ہوتا ہے اور ہر ایک نے الگ الگ اس کی غلطی کو نوٹ کرنا ہوتا ہے۔ الفاظ کی غلطی کہاں؟ حروف کی ادائیگی کی غلطی کہاں؟ یہاں غنہ نہیں کیا، یہاں مد ٹھیک نہیں کھینچی، فلاں نہیں کیا، صفات کا بھی خیال رکھتے ہیں، تجوید کا بھی اور ہر ایک اپنا اپنا لکھتا رہتا ہے۔ چار پانچ ممتحن اس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس سے صرف ایک سوال پوچھتے ہیں، کون سا سوال پوچھتے ہیں؟ کہنے لگے کہ جی وہ پانچ حافظ ایک وقت میں بیٹھ کر اس بچے کو کہتے ہیں کہ بچہ ہمیں پورا قرآن سنا دو، بس ایک سوال کرتے ہیں اس سے کہتے ہیں کہ بچہ پورا قرآن سنا دو اس بچے کو ''الـم'' سے لے کر ''والـنـاس'' تک پورا قرآن پانچ استادوں کے سامنے پڑھنا ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے ایک بچے کو پیش کیا، وہ بچہ یہی ماشاء اللہ حافظ محمد دین کی عمر کا بچہ تھا، اسی قد و قامت کا۔ کہنے لگے: اس بچے نے دو دن پہلے امتحان دیا، جب ہم نے اسے کہا کہ بچہ قرآن سنا دو! تو اس نے الحمدللہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایسے اس نے پڑھا جیسے پانی پر کوئی چیز تیرتی جاتی ہے۔ سناتے ہوئے نہ کہیں اٹکا نہ بھولا، نہ کہیں متشابہ لگا، نہ کہیں لوٹایا۔ اس نے اس طرح الحمد سے والناس تک پورا قرآن پاک سنا دیا۔ تو آٹھ گھنٹے کے اندر آج ایک بچہ اللہ کے قرآن کو بیٹھ کر سنا دیتا ہے۔ جس طرح مردوں نے اسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا، عورتوں نے بھی اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا، یہ کون تھے؟ یہ قرآن مجید کی سافٹ کاپیز تھیں اور اب بھی دنیا میں موجود ہیں۔

دہریوں کے ملک میں حفاظتِ قرآن:

ہمارے ایک دوست تھے غالباً 1973ء کی بات ہے۔اس زمانے میں ایک ایسا وقت آ گیا تھا کہ جب سوشلزم، دہریت، کیمونزم والے بڑے ایکٹو ہو گئے تھے۔کوئی کہتا تھا کہ ایشیا سرخ ہے، کوئی کہتا تھا کہ ایشیا سبز ہے، وہ عجیب سا سلسلہ تھا۔اس زمانے میں ہم یونیورسٹی میں تھے، ہمارے ایک دوست سٹیل مل کراچی کے اندر جاب کررہے تھے۔مل والوں نے ان کو رشیا بھیجا ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے۔وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کا دن تھا میں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے مسجد دکھاؤ، میں مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔لوگوں نے کہا کہ جی یہاں باقی مسجدیں تو بند ہیں بس ایک دو مسجدیں ٹورسٹ (سیاحوں) کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔آپ یہیں اپنی جگہ پر پڑھ لیں۔میں نے کہا نہیں میرا دل کافی اداس ہے میں مسجد کے لیے جاتا ہوں مسجد میں۔میں گیا، وہاں مسجد کا خادم ملا، میں نے کہا کہ مسجد کھولو! اس نے کہا: کہ جی کھول تو میں دیتا ہوں اگر آپ کو پولیس پکڑ کر لے گئی تو ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔میں نے کہا: کہ مجھے پرواہ نہیں ہے۔میں اپنے ملک میں بھی مسلمان تھا، یہاں بھی مسلمان ہوں، میں اگر اپنی نماز ادا کروں گا تو کون مجھے پکڑ سکتا ہے؟ میں مہمان ہوں، بھاگ کے تو نہیں آیا۔کہنے لگے: کہ میں نے اذان دی، نماز پڑھی۔قریب کے گھروں کے جو بچے تھے انہوں مجھے دیکھ لیا۔انہوں نے اپنے گھر والوں کو جا کے بتا دیا، جب میں نماز پڑھ کے نکلنے لگا تو قریب کے چند مرد و عورتیں تھیں، وہ آئے، انہوں نے اشارہ کیا کہ آپ ہمارے پاس چائے کی دعوت قبول فرمائیں۔میرے پاس بھی وقت تھا، میں نے کہا: بہت اچھا۔کہنے لگے کہ میں ان کے گھر چلا گیا تو انہوں نے کنڈی لگا لی۔جب انہوں نے دیکھا کہ اب باہر کا بندہ کوئی نہیں تو وہ بڑے مطمئن ہو گئے کہ چلو سب اپنے ہیں، اب کوئی انٹیلی جنس والا نہیں جو شکائت لگا کر مصیبت کھڑی کرے گا۔کہنے لگے کہ انہوں

نے کھانا کھلایا، چائے پلائی، پھر پاکستان کے بارے میں، مسلمانوں کے بارے میں باتیں پوچھنے بیٹھ گئے۔ اب صورتِ حال ایسی تھی کہ جہاں میں بیٹھا تھا میرے آگے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، ان کے پیچھے مرد تھے اور مردوں کے پیچھے گھروں کی عورتیں بھی تھیں۔ قدرتاً میرے دل میں خیال آیا میں نے آگے بیٹھے بچے سے پوچھا کہ بچے تم قرآن پاک پڑھنا جانتے ہو؟ اس نے سر ہلایا کہ ہاں میں جانتا ہوں، میں نے اپنی جیب سے چھوٹا قرآن مجید نکالا اور اس کے سامنے یوں کر کے کہا کہ اچھا یہاں سے پڑھو! اب وہ بچہ کبھی قرآن مجید کو دیکھتا ہے کبھی مجھے دیکھتا ہے، میں نے کہا: کہ پڑھو نا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦)

جیسے ہی میں نے دو لفظ پڑھے تو بچے نے پڑھنا شروع کر دیا اور پڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرانگی ہوئی کہ پہلے پڑھتا ہی نہیں تھا، اب پڑھنا شروع کیا تو رکتا ہی نہیں۔ میں نے اس کے والد سے پوچھا کہ یہ کیا مسئلہ ہے؟ تو اس کے والد نے کہا کہ جی بات یہ ہے کہ آپ لوگ خوش نصیب ہیں، مسلمان ہیں، مسلمانوں کا ملک ہے، آپ کے گھروں میں مسجدوں میں ہر جگہ پر اللہ کا کلام موجود ہے، جہاں چاہو بیٹھ کر پڑھو، کوئی روکنے والا نہیں۔ ہم جس ملک میں ہیں یہاں ہم گھروں میں نہیں رکھ سکتے، مسجدوں میں نہیں رکھ سکتے، اگر کسی کے ہاں سے ایک ورق بھی مل جائے تو اس گھر کے لوگوں کو پھانسی کی سزا ملتی ہے۔ چنانچہ ہم نے تو اپنے بچوں کو کبھی قرآن پاک دکھایا بھی نہیں اور دیکھا بھی نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہمارے جو پرانے حافظ تھے، جب انقلاب آیا تو ہم اپنے بچوں کو ان کے پاس شاگرد بنا کر بھیج دیتے تھے کہ یہ درزی ہیں اور ہمارا بچہ درزی کا فن سیکھے گا۔ استاد اس کو کپڑے سینا بھی سکھاتا اور ساتھ ساتھ نابینا بچے کی طرح دو دو تین تین آیتیں زبانی بتا دیتا۔ وہ بچہ زبانی یاد کر لیتا، چنانچہ زبانی سن کر یاد کرتے کرتے ایسا وقت آ جاتا کہ بچہ قرآن پاک کا حافظ تو بن جاتا اس کو قرآن

پاک ناظرہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ دیکھا تو کبھی نہیں تھا۔ تو جب آپ نے پہلے دکھایا کہ جی یہاں سے پڑھو تو اسے کیا پتہ، اس نے تو کبھی قرآن پاک دیکھا ہی نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ میں حیران ہوا کہ لوگو! تم کاغذ پر لکھے ہوئے قرآن پر تو پابندیاں عائد کر سکتے ہو، جو سینوں پر لکھا ہوا ہے، تم اس پر کیسے پابندی عائد کر سکتے ہو؟

مدارس......قرآن مجید کے کاپی سنٹر:

یہ حفاظ قرآن مجید کی (Soft Copies) سوفٹ کاپیز ہیں۔ اسی لیے حافظ کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیے، حافظ کو محبت کی نظر سے دیکھنا چاہیے، احترام کرنا چاہیے، وہ اللہ رب العزت کے کلام کو سینے میں لے کے پھر رہا ہوتا ہے اور حافظ کو بھی اپنے اس کلام کی قدر کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی سوفٹ کاپیز کو آج کل مدارس کے اندر بنایا جاتا ہے۔ کاپی سینٹر ہوتے ہیں نا جیسے فوٹو کاپی سینٹر ہوتے ہیں۔ تو یہ جو مدارس ہیں نا ان کا ٹیکنیکل نام ہے قرآن کاپی سنٹر کہ ایک بندے کو اللہ نے قرآن مجید کا حافظ بنا دیا تو وہ بیٹھ کر ماشاء اللہ دوسرے بچوں کے ذہن میں، دلوں میں، اس کو کاپی کر دیتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں کوئی بچہ بچی قرآن مجید کا حافظ ہو۔

قرآن مجید کی ہارڈ کاپی

اس امت میں قرآن مجید کو ایک اور انداز سے بھی محفوظ کیا گیا جس کو کہتے ہیں ہارڈ کاپی۔

کاتبین وحی:

چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جب وحی اترتی تھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو وحی [illegible]

سولہ کے قریب حضرات تھے جو لکھنا جانتے تھے، وقتاً فوقتاً کبھی کوئی کبھی کوئی جو بھی حاضر ہوتا آپ ان کو بلاتے اور ان کو یہ آیتیں لکھوا بھی دیتے تھے۔ تو اس کو کبھی چمڑے کے اوپر اور کبھی لکڑی کے تختے کے اوپر کبھی کپڑے کے اوپر، ایسی چیزوں کے اوپر لکھ لیا جاتا تھا۔ یہ حضرات کاتبینِ وحی کہلاتے ہیں، وحی کو لکھنے والے۔ چنانچہ جب بھی وحی اترتی تھی اس کو باقاعدہ لکھوا دیا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ..... جامع القرآن:

جب نبی علیہ السلام اس دنیا سے تشریف لے گئے تو عمر رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر المؤمنین! جتنے پرچہ جات لوگوں کے پاس موجود ہیں آپ بہتر ہے کہ ان کو ایک جگہ پر اکٹھا کر کے اپنے کنٹرول میں لے لیں، اس سے پہلے کہ کوئی Misplace (ضائع) ہو جائے۔ قصہ مختصر یہ کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بنا دی جو سارے حفاظ تھے اور ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ جو مختلف جگہوں پر چہ جات ہیں ان کو ایک جگہ پر اکٹھا کریں۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام چیزوں کو ایک جگہ پر یکجا کر دیا۔ اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے، قرآن مجید کو یکجا کرنے والے۔

سات سٹینڈرڈ نسخے:

پھر اس کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک وقت آیا کہ جب اسلام خوب چاروں طرف پھیلا، چوالیس ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کہ اس وقت چمڑے کے اوپر کھدائی کر کے اس کو لکھوایا اور اس کی سات کاپیاں بنوائیں، سات جلدیں بنوائیں اور سات مختلف ملکوں میں، علاقوں میں اس کو بھیجا۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے، ہم نے یکجا کر دیا ہے اب اس کو تم ریفرنس کاپی سمجھ کر اس کے

مطابق آگے چلاتے رہو۔ چنانچہ یہ کاپی پوری دنیا میں پھیلی۔ آج بھی دنیا کے عجائب گھروں میں یہ کاپیاں موجود ہیں۔ چنانچہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا جو صحیفہ تھا آج کل تاشقند میں ایک مسجد ہے، اس کو تلہ شیخ کی مسجد کہتے ہیں۔ اس میں وہ ابھی بھی موجود ہے۔ اللہ اکبر۔

یہ جو کتابت کا سلسلہ تھا یہ بھی پھر چل پڑا۔ پھر کچھ لوگوں نے اپنے لیے قرآن مجید لکھنے شروع کر دیے۔ کچھ کاتب لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خوشخطی دیتے ہیں انہوں نے مستقل قرآن مجید اپنے لیے دوسروں کے لیے لکھنا شروع کر دیے یہ کتنا لیبورلیس کام تھا آج تو فوٹو کاپی کرو، پرنٹ کرو، کتنی آسانی ہے۔ اُس وقت گھر کے اندر قرآن پاک رکھنے کے لیے پورے قرآن کو لکھوایا جاتا تھا۔

کتابتِ قرآن میں خواتین کی خدمات:

یہ کام بنین کی نسبت بنات نے زیادہ کیا، مردوں کی نسبت عورتوں نے زیادہ کیا بچوں کی نسبت بچیوں نے زیادہ کیا۔ چنانچہ کیا ہوتا؟ ہر بچی پڑھ کے جب عالمہ بن جاتی تھی، ابھی اس کی شادی میں کچھ وقت ہوتا تو وہ کیا کام کرتی روزانہ گھر کے کام سے فارغ ہو کر وضو کر کے بیٹھ جاتی اور اپنے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ تیار کرتی، خوبصورت لکھتی، بہت محبت سے ایک ایک صفحہ لکھتے لکھتے جب پورا قرآن پاک وہ تیار کر لیتی تو اس کے والدین اس کی سنہری جلد بنوا دیتے۔ جب اس بچی کی شادی ہوتی تو جہیز میں اس بچی کو قرآن پاک ساتھ دیا جاتا۔ اس دور میں ہر بچی اپنے لیے قرآن مجید لکھتی تھی۔ چنانچہ بچیوں کے ذریعے ہر گھر میں قرآن پہنچنا شروع ہو گیا اور یوں امت میں پھیلتا چلا گیا۔

کتابت کے مختلف انداز:

لکھنے والوں نے قرآن مجید بھی خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں موٹا بھی

لکھا، باریک بھی لکھا۔ چنانچہ ہم نے سمرقند کی ایک لائبریری میں قرآن مجید کو لوہے کی پلیٹوں پر لکھا ہوا دیکھا۔ پلیٹیں تھی جیسے چار فٹ بائی آٹھ فٹ کی پلیٹ، پوری لوہے کی شیٹ بیڈ سائز جتنی بڑی تھی اور چھت تک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک پلیٹ ایک صفحہ تھا۔ اور اس کے اوپر انہوں نے انگریو کیا ہوا تھا، یعنی پینٹ سے لکھنے کی بجائے اس کو کھودا گیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ قرآن مجید کی کاپی کیسی؟ وہ کہنے لگے: جی دیکھیں کہ لوگوں کے ہاں ٹائم کا ایک سٹینڈرڈ ہوتا ہے۔ یہ گرین وِچ ٹائم ہے، یہ فلاں ٹائم ہے، جس نے گھڑی ملانی ہو فلاں ٹائم کے ساتھ ملا لو۔ اسی طرح پہلے وقت کے علما نے اس کو لوہے پر کھود کر لکھوا لیا تاکہ قرآن پاک محفوظ ہو جائے۔ صدیوں سلامت رہے۔ اور اگر کبھی کہیں قرآن مجید میں کسی لفظ کے لکھنے میں کوئی شبہ وارد ہو تو اس قرآن مجید کے لفظ کو اس سٹینڈرڈ کے ساتھ لاکر ملا لیا جائے۔ وہ قرآن مجید کا سٹینڈرڈ بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان کہ چھوٹے چھوٹے نسخے بھی موجود ہیں۔ کئی ایسے کاتب تھے جو باریک لکھنے میں ماہر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مختلف صفات دی ہیں۔ وہ باریک لکھنے میں ماہر تھے، چنانچہ ایک کاتب کے بارے میں آتا ہے کہ چاول کے ایک دانے کے اوپر قل ھو اللہ کی پوری سورۃ کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک چاول کے اوپر کتنا باریک لکھتے ہوں گے، اتنا باریک نویس کہ ایک چاول کے اوپر پوری سورۃ قل ھو اللہ احد کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسے بھی کاتب تھے۔

چنانچہ ہم نے سمرقند کی ایک لائبریری میں ایک چھوٹا سا قرآن مجید دیکھا، بالکل اتنا چھوٹا سا جیسے کوئی تعویز سا ہوتا ہے۔ اور لکھنے والے نے اس کو ہاتھ سے لکھا تھا۔ اور پھر ہم نے وہاں پر ایک اور قرآن مجید بھی دیکھا، وہ پتوں کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ بالکل اس کا صفحہ ہم نے دیکھا جیسے بڑے پتوں کا کوئی درخت ہو تو اس کے پتے لے

لیے جائیں، خشک کر لیے جائیں۔ اللہ کی شان انہوں نے پتوں پر کوئی کیمیکل لگایا تھا یا کیا؟ پتوں کی رگیں نظر آتی تھیں، پتے صاف نظر آتے تھے۔ اور اس کے اوپر قرآن پاک لکھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ اس کی تاریخ بنتی ہے جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس وقت لوگ پتوں پر قرآن مجید لکھ کر اس کی جلد بنا کے رکھا کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید بھی آج دنیا میں موجود ہے۔ تو یہ قرآن مجید لکھنے کا بھی سلسلہ عجیب ہے۔

طباعتِ قرآن کی تاریخ:

پھر رشیا میں ایک علاقہ ہے اس کا نام ہے قازان۔ قازان میں ایک عالم تھے ان کا نام تھا حمزہ بے۔ انہوں لینن گراڈ میں ایک پرنٹنگ پریس میں سب سے پہلے قرآن مجید کو پرنٹ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد ہنبرگ جرمنی کے اندر قرآن مجید پرنٹ کیا گیا۔ پھر تیسرے نمبر پر ایران میں اسی طرح پرنٹنگ پریس پر چھاپہ گیا۔ تو چھپائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ الحمد للہ آج پرنٹنگ پریسوں پر اتنے قرآن مجید چھپ رہے ہیں بڑے سائز میں چھوٹے سائز، درمیانے سائز میں، مختلف رنگوں میں۔ آپ جیسا خوبصورت قرآن مجید چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ الحمد للہ آج دنیا میں ہر قسم کے قرآن پاک موجود ہیں۔

میونخ یونیورسٹی کی تحقیق:

جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں ایک مرتبہ ایک پروجیکٹ دیا گیا۔ پروجیکٹ یہ تھا کہ مسلمان دعوٰی کرتے ہیں کہ جی ہماری کتاب محفوظ ہے۔ جب یہ دنیا کے اتنے مما لک میں پرنٹ کی جاتی ہے تو کہیں نہ کہیں تو کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہو سکتی ہے۔ تو اس کو Verify (تصدیق) کیا جائے۔ واقعی یہ ویری فائی کرنا ایک بڑی بات تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک فنڈ الگ کر دیا اور تحقیق کے لیے کچھ لوگ مخصوص کر دیے۔ انہوں نے

دنیا کے مختلف ممالک کے شہروں سے قرآن مجید خریدے اور چالیس ہزار کا پیاں اکٹھی کر لیں۔ ایک جگہ پر سٹاک رکھ کے انہوں نے ان کو آپس میں کمپیئر کرنا شروع کر دیا۔ چالیس ہزار قرآن مجید کے ایک ایک لفظ کو آپس میں تقابل کر کے دیکھا گیا تو وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ کہیں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

''اس نصیحت نامے کو ہم نے ہی نازل کیا اور اس کی حفاظت کے بھی ہم ہی ذمہ دار ہیں''

مسلمان ہونے کی وجہ:

چنانچہ ایک آدمی مسلمان ہوا۔ پوچھا کہ بھئی کیسے مسلمان ہو گئے؟ کہنے لگے کہ میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہودی کہتے ہیں کہ ہم ٹھیک ہیں، عیسائی کہتے ہیں کہ ہم ٹھیک ہیں، مسلمان کہتے ہیں ہم ٹھیک ہیں، دنیا کے تین بڑے مذاہب تو یہی ہیں نا تو میں نے کہا کہ مجھے کیا پتہ کون ٹھیک ہے؟ تو میں ویری فائی تو کروں۔ تو کہنے لگا کہ میں نے انجیل لی اس کو کاتب کے ذریعے سے میں نے لکھوایا، اس کو کہا کہ یار کہیں کہیں تھوڑا اپنی مرضی سے اونچ نیچ کر لینا اور یاد رکھنا کہ کہاں تم نے اس میں گڑ بڑ کی تھی۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب لکھوائی اور ایک عیسائی پادری کے پاس لے کر گیا، میں نے کہا: جی میرے پاس یہ لکھی ہوئی کتاب ہے میں آپ کو تحفہ دینے آیا ہوں اور جب میں نے اس کو تحفہ دیا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ ایک سال میں نے انتظار کیا، ایک سال میں وہ میرے پاس نہ آیا کہ اس میں کوئی کمی بیشی ہے۔ تو میں سمجھ گیا کہ اس کتاب کی حفاظت بالکل نہیں اگر ہوتی تو اس میں اس کو غلطی کا پتہ چل جاتا۔ تو میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ غیر محفوظ کتاب ہے۔

پھر میں نے ایک تورات لی اس کو بھی میں نے لکھوایا اور اس میں بھی اسی طرح

گڑ بڑ کروائی اور ایک ربائی کو جا کر میں نے ہدیہ دیا۔ ایک سال میں نے انتظار کیا ایک سال تک وہ بھی اس کو ہر ہفتے کے دن پڑھ پڑھ کے سناتا تھا اپنے عبادت خانے میں لیکن اس کو بھی کہیں پتہ نہ چلا کہ اس میں کہیں کمی بیشی ہوئی کہ نہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ کتاب بھی غیر محفوظ ہے۔

پھر میں نے قرآن پاک لیا اور اس کی کاپی بنوائی اور کاتب کو کہا کہ اس میں بھی کہیں کہیں اپنا کرتب دکھا دینا۔ کاتب بھی تو کرتب دکھاتے ہیں نا۔

ایک کاتب کے کرتب:

چنانچہ ایک کاتب تھا جس کو لکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ اونچ نیچ کر دینے کا شوق تھا، وہ کوئی نہ کوئی کمی بیشی کر ہی دیتا تھا۔ لوگ مسودہ لے کر آتے تھے اور وہ اپنی مرضی سے کچھ تبدیلی کر دیتا تھا۔ ایک بندے نے اس سے قرآن پاک لکھوانا تھا، اس نے کہا کہ بھئی! میں نے سنا ہے تم کچھ اپنی مرضی سے ہیر پھیر کر دیتے ہو، خبر دار! اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کرنا۔ اب وہ جاہل تھا، اتنا علم تو تھا ہی نہیں۔ کاتب نے قرآن پاک لکھ دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ قرآن پاک لینے آیا تو پوچھا کہ اس میں تم نے کوئی گڑ بڑ تو نہیں کی؟ کہا نہیں نہیں، گڑ بڑ میں نے کوئی نہیں کی، بس ایک دو جگہ ایسے ذرا مجھے کچھ محسوس ہوا تھا، اس نے کہا کیا؟ کہنے لگا کہ لکھا ہوا تھا ﴿فَخَرَّ مُوْسٰی﴾ تو خر تو گدھے کو کہتے ہیں اور گدھا تو عیسیٰ علیہ السلام کا تھا جبکہ یہاں موسیٰ علیہ السلام کا نام لکھا ہوا تھا تو وہاں میں نے موسیٰ کی جگہ عیسیٰ کا نام لکھ دیا۔ اور عصٰی آدم اور عصا تو تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا تو نام آدم علیہ السلام کا لکھا ہوا تھا۔ تو میں نے آدم علیہ السلام کی جگہ موسیٰ علیہ السلام کا نام لکھ دیا۔ اس نے پوچھا اور کیا کیا۔ اس نے کہا: میں نے اور کیا کرنا تھا ایک دو جگہ میں دیکھا کہ فرعون کا نام تھا، قارون کا نام تھا تو وہ مجھے اچھے نہ لگے کہ دیکھو! یہ کافر ایمان والوں کے دشمن لوگ ہیں ان کے نام قرآن میں تو نہیں ہونے

چاہییں چنانچہ میں نے تمہارے باپ اور دادا کا نام لکھ دیا۔ اس نے کہا اور کیا کیا؟ کہنے لگا یار بس مجھے تین چار جگہ شیطان کا نام بھی ملا تو میں نے کہا کہ اس مردود کا نام تو بالکل نہیں ہونا چاہیے تو کیونکہ تم لکھوا رہے تھے تو میں نے اس کی جگہ تمہارا نام لکھ دیا۔

تو جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایڈیشن نہیں ہوسکتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب کوئی ایسی کاپی پرنٹ ہی نہیں ہوسکتی جس میں کسی لفظ کی غلطی نہ ہو، ایسا ممکن ہے لیکن غلطی اس میں قرار نہیں پکڑ سکتی۔ کوئی بندہ چھاپنے والا چھاپ سکتا ہے۔ جس میں غلطی سے کوئی حرف چھوٹ گیا ہو، کوئی نکتہ رہ گیا ہو، کوئی زیر زبر کی غلطی رہ گئی ہو۔ لیکن وہ غلطی قرار نہیں پکڑ سکتی۔ جیسے ہی کسی کے پاس آئے گا تو وہ بندہ اس کو دیکھے گا تو حافظ فوراً اس کو بتا دے گا کہ بھئی یہ تو یہاں سے ٹھیک نہیں۔ تو غلطی اس میں قرار نہیں پکڑ سکتی۔

وہ کہنے لگے کہ میں نے قرآن پاک لکھوایا جس میں میں نے کاتب سے کرتب بھی ڈلوایا اور میں اسے ایک حافظ قرآن کے پاس لے کر گیا اور کہا کہ یار! میرے پاس یہ ایک کتاب تھی تو میں تمہیں ہدیہ دینے آیا ہوں۔ کہنے لگے کہ تین دن نہیں گزرے تھے کہ میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب ذرا سیریس ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ یہ کاپی آپ نے کس سے لکھوائی تھی۔ میں نے کہا کہ ایک کاتب سے لکھوائی تھی۔ اس نے کہا: کہ اس نے سوتے ہوئے لکھی تھی، یا جاگتے ہوئے لکھی تھی۔ میں نے کہا کہ یار جاگتے ہوئے ہی لکھی ہوگی۔ کہنے لگا: کہ اس میں اس نے اتنی غلطیاں کیں! کہنے لگا: کہ پہلے صفحے سے اس نے کھولنا شروع کیا ہر ہر جگہ پر جہاں جہاں اس نے کچھ کمی بیشی کی تھی سب جگہ پر نشان لگا کر پورے قرآن پاک میں جو اس نے غلطیاں کی تھیں سب کو الگ کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ

واقعی دنیا کی یہ وہ کتاب ہے جس کے اندر کسی اور چیز کی ملاوٹ کرنا ممکن نہیں ہے۔
لہٰذا کلمہ پڑھ کر میں مسلمان ہو گیا۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

''بیشک اس قرآن مجید کو ہم نے ہی نازل کیا اور اس کی حفاظت کے بھی ہم ہی ذمہ دار ہیں''

کفر کا اعترافِ حقیقت:

اب آپ کو ایک بات سنائیں اور پھر جان بخشی کریں۔ یہ عاجز ان دنوں واشنگٹن میں تھا تو وہاں پر ایک کمیٹی بنی ہوئی تھی Interfaith Counsil (انٹر فیتھ کونسل) اس کا نام تھا۔ کسی نے آ کے بتایا کہ جی اس میں ہندو بھی ہیں، یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، فلاں بھی ہیں مگر مسلمان کوئی بھی نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جب اکٹھے مل بیٹھتے ہیں نا تو ظاہر تو کرتے ہیں کہ ہم نے مختلف ادیان کو سمجھنے کے لیے یہ بنائی ہے، مگر نزلہ سارا اسی پر گرتا ہے جو موجود نہیں ہوتا تو وہ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ تو اسلام کے خلاف بہت ہی زیادہ کام کر رہے ہیں لہٰذا کسی نہ کسی کو وہاں جانا چاہیے۔ اب علاقے کے علما سے مشورہ کیا گیا کہ بھئی وہاں جانے کے لیے تو ایسا بندہ ہو کہ جس کو اگر کچھ دین کا علم ہے تو ساتھ اس کو موجودہ علوم بھی حاصل ہوں تاکہ ان سے بات بھی کر سکے۔ انگریزی میں بات کر سکے سائنٹفک بیک گراؤنڈ ہو وہ سائنسی سوالات کریں تو وہ ان کو نمٹا سکے۔ تو اللہ تعالیٰ کی شان کہ انہوں نے اس عاجز کو اس کام کے لیے متعین کر دیا۔ انکار تو کیا، لیکن جب انہوں نے کہا کہ ہم سب علما مل کے کہہ رہے ہیں کہ آپ جائیں تو اس عاجز نے ہمت کر لی۔ لو جی ہم نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔

پہلی بات تو یہ کہ جب میں وہاں جاتا تھا تو یہی عمامہ، یہی جبہ، یہی عصا، بالکل اسی حالت میں جاتا تھا۔ جب پہلے دن جا کے ان کو بتایا کہ جی میں مسلمان ہوں ہم

آئے ہیں کہ اگر آپ کو اس کے بارے میں کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لیا کریں، مجھے پتہ ہوگا تو میں جواب دے دوں گا اور اگر مجھے نہیں پتہ ہوگا تو میں اپنے بڑوں سے پوچھ کے آپ کو جواب دے دوں گا، مقصد تو آپ کو Satisfy (مطمئن) کرنا ہے۔ تو وہ تھوڑا محتاط ہو گئے۔ چنانچہ اگلی لسٹ میں اسلام کا نام سب سے پہلے لکھنا شروع کر دیا۔ اب یہ ایک روٹین بن گئی، ہم جاتے رہتے۔ میں نے دیکھا کہ جو یہودی ربائی تھا، بڑے غور سے مجھے آتے جاتے دیکھتا تھا۔ شاید دل میں سوچتا ہو، یہ میرا گمان ہے کہ بھئی عصا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت تھی آج ہمیں اس بندے کے ہاتھ میں وہ سنت نظر آ رہی ہے۔ اور ایک دن اس کی تصدیق ہو گئی کہ جب میں آ کے اس کے پاس بیٹھا کرسی پے تو کہنے لگا:

You always come with a different respective look

''آپ ہمیشہ ایک باوقار شکل میں آتے ہیں''

یہ اس کے الفاظ تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنت نے اس کے دل کے اوپر بھی ایک رعب قائم کر دیا۔ اللہ کی شان۔ ایک دن کی بات ہے کہ سیکرٹری نے کہا کہ جی اچھا اگلی میٹنگ کب ہو اور اس کا کیا ایجنڈا ہو؟ تو میں نے انہیں کہا کہ اگلی میٹنگ کا ایجنڈا یہ ہونا چاہیے کہ ہر دین والا اپنے ہاں جو اللہ کا کلام ہے اس کو اگلی میٹنگ میں پڑھے اور تھوڑا سمجھائے تا کہ ہمیں سب آسمانی کتابوں کو سننے سمجھنے کا موقع مل جائے۔ تو Word of God (اللہ کے کلام) کو پڑھے اور ہمیں بتائے۔ بس اتنی تھوڑی سی بات کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ سیکرٹری تو بہت خوش ہو گیا۔ کہنے لگا: ہاں اگلی میٹنگ کا ایجنڈا یہی ہے، ہر دین والا اپنی جو کتاب ہے جو Word of God ہے اس کو پڑھے گا اور اس کے بارے میں سمجھائے گا۔

اگلی میٹنگ میں گئے تو سیکرٹری نے سب سے پہلے نام ہی میرا لیا۔ کیونکہ انہوں

نے ہی Suggestion (تجویز) دی تھی۔ لہٰذا اسٹارٹ یہی کریں۔ لو جی ہم نے قرآن مجید میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور اس کے بارے میں کچھ سمری ان کو بتا دی کہ کیوں سورۃ فاتحہ تلاوت کی؟ حدیث پاک میں آتا ہے: جو تمام آسمانی کتابوں میں تھا سب کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرما دیا اور جو پورے قرآن مجید میں تھا اس کو سورۃ بقرہ میں نازل فرما دیا اور جو کچھ سورۃ بقرہ میں تھا اس کو سورۃ فاتحہ میں نازل فرما دیا تو سورۃ فاتحہ یہ سمری ہے پورے قرآن مجید کی لہٰذا ہم نے اس کی تلاوت کی اور تلاوت کر کے اس کے بارے میں بتا دیا چلیں بات مکمل ہو گئی۔ اب آگے وہ بیٹھے ہوئے تھے پادری صاحب۔ ان کی باری آئی تو انہوں نے اپنی بائبل کھولی اور پہاڑی کا خاص وعظ ہے یہودی بڑے مزے سے پڑھتے ہیں اس وعظ کو، تو انہوں نے وہ پہاڑی کا وعظ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب پڑھا تو میں نے کہا کہ جی میرا اس پر Question (سوال) ہے سیکرٹری نے پوچھا کیا؟ میں نے کہا کہ ایجنڈا میں یہ بات پاس ہوئی تھی کہ ہر دین والا جو کچھ ان کے پاس اللہ کا کلام ہے وہ پڑھ کے سنائے گا۔ یہ تو انگریزی پڑھ رہے ہیں، تو کیا بائبل انگریزی میں آئی تھی؟ اب جب میں نے یہ پوائنٹ کھولا تو ان کو فیل ہو گیا کہ او ہو او ہو ہم تو ٹریپ ہو گئے۔ اب وہ عیسائی پریشان۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں، اس لیے کہ وہ تو عبرانی زبان میں تھی۔ اب تورات والا بھی پریشان، وہ بھی پریشان، آدھا منٹ تقریباً خاموشی رہی۔ آدھے منٹ کے بعد وہ جو یہودی ربائی تھا، وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ مسٹر احمد (مجھے احمد کہتے تھے) میں اس بات کو آج سب کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت پوری دنیا کہ مذاہب میں سے صرف مسلمان ایسے ہیں جن کے پاس Word of God (اللہ کا کلام) اصلی حالت میں موجود ہے۔ ہمارے پاس تو فقط ٹرانسلیشن موجود ہے۔ اتنی خوشی ہوئی، اس دن اتنی خوشی ہوئی کہ اللہ! پوری دنیا کے لوگ بالآخر اس بات کو ماننے

پے مجبور ہو گئے کہ تیرا ایک قرآن ہی محفوظ ہے اس کے سوا کوئی اور کتاب محفوظ نہیں ہے۔ میں نے کہا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

''ہم نے ہی اس قرآن مجید کو نازل کیا اور اس کی حفاظت کے بھی ہم ہی ذمہ دار ہیں۔''

خطابِ شاہانہ:

اب اس کا ترجمہ میں ذرا ایک نکتہ سن لیجیے۔ انا ہم نے نحن ہم نے نزلنا ہم نے۔ تو یہ عجیب سا خطاب ہے۔ بندہ تو ایک دفعہ کہتا ہے کہ جی ہم نے نازل کیا۔ کافی ہوتا ہے نہیں انا ہم نے، نحن اس کا معنیٰ بھی ہم نے، نزلنا اس کا معنیٰ بھی ہم نے، یہ کیا مسئلہ ہے؟ تو علما نے اس کے معارف کو کھولا۔ وہ کہتے ہیں کہ تاکید میں کئی مرتبہ بات کو ذرا الٹا کے کیا جاتا ہے تاکہ اگلے کے دل کو تسلی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس صیغے میں جو ان الفاظ کو استعمال کیا مقصد تاکید تھا کیا؟ ہم نے، ہاں ہم نے، ہاں ہاں ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا اور اس کی حفاظت کے بھی ہم ہی ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قرآن پاک کے فیوضات سے انوار و برکات سے حصہ نصیب فرمائے اور قیامت کے دن اس قرآن مجید کی شفاعت نصیب فرمائے اور جو بچہ حافظ بنا اللہ تعالیٰ اس بچے عاملِ قرآن بنائے، عالمِ قرآن بنائے، ناشرِ قرآن بنائے، داعیِ قرآن بنائے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کو عاشقِ قرآن بنائے۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب جتنے بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس بچے کی خوشیاں نصیب فرمائے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَال فَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَان﴾

احساسِ امانت

بیان: محبوب العلماء والصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 2 نومبر 2008ء مطابق ۱۴۲۸ھ

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

موقع: چودھواں سالانہ تربیتی نقشبندی اجتماع

احساسِ امانت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ)) (کنز العمال، رقم:۸۴۳۹)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ بیشک ہم نے اپنی امانت کو پیش کیا ﴿عَلَى السَّمٰوٰتِ﴾ آسمانوں پر ﴿وَالْاَرْضِ﴾ زمین پر وَالْجِبَالِ پہاڑوں پر ﴿وَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا﴾ ان سب نے اس کو اٹھانے سے معذرت کر لی ﴿وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ اور ڈر گئے اس بوجھ سے ﴿وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ انسان نے اس بوجھ کو اٹھا لیا۔ ﴿اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ یہ ہے بڑا ظالم اور اپنے انجام سے بے خبر۔

امانت کے معنی:

امانت کے کیا معنی ہیں؟ ہمارے ماحول اور معاشرے میں اس کا تصور بہت محدود ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے پیسے لائے گا اور کہے گا کہ یہ میری امانت

ہے رکھ لیں، پھر واپس لے لوں گا۔ اب کچھ مدت کے بعد یہ شخص مانگنے آیا اور دینے والے نے دے دیا تو امانت ادا ہوگئی۔ اور اگر اس میں اس نے کوتاہی کی تو یہ امانت میں خیانت ہوگئی۔ یہ ہمارے دل و دماغ میں امانت کا بہت محدود تصور ہے۔

شریعت میں امانت کے معنی بہت Broad (وسیع) ہیں۔ چنانچہ امانت کہتے ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا، اعتماد کرنا اور اس بندے کا اس اعتماد کو پورا کر دینا یہ امانت ہے۔ کسی کا کسی معاملے میں کسی پر اعتماد کرنا اور جس پر اعتماد کیا جائے اس کا اس اعتماد کو پورا کر دینا، یہ امانت کہلاتی ہے اور اگر اس نے پورا نہ کیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

امانت شریعت کی نظر میں:

قرآن مجید میں خیانت کو حرام قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَخُوْنُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِکُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! نہ خیانت کرو اللہ کے ساتھ نہ اسکے رسول ﷺ کے ساتھ اور نہ خیانت کرو اپنی امانتوں کے ساتھ، جو ایک دوسرے کو لیتے دیتے ہو۔ اور تم اس بات کو جانتے ہو''

چنانچہ امانت میں خیانت اس کو شریعت نے گناہ کبیرہ بتایا ہے

ابو امامہ راوی ہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((یُتْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَی الْخِلَالِ کُلِّھَا اِلَّا الْخِیَانَۃَ وَ الْکِذْبَ))

(اطراف المسند المعتلی، رقم:۷۶۹۸)

''کہ مومن کی طبیعت میں ہر خصلت آسکتی ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے''

یہ مومن کی طبیعت کے اندر نہیں آسکتی، باقی گناہ تو وہ کر بیٹھتا ہے لیکن خیانت اور

جھوٹ، یہ دو ایسے گناہ ہیں کہ مؤمن اس کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اور ایک حدیث مبارکہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ))

''منافق کی تین نشانیاں ہیں''

((اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ))

''جب بھی بولے تو جھوٹ بولے''

((وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ))

''جب وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے''

((وَ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) (سنن الترمذی، رقم:۲۵۵۵)

''اور جب امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے''

شریعت نے اس امانت کو اتنا بڑا عمل جان لیا کہ مسند احمد کی روایت ہے فرمایا:

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ)) (کنز العمال، رقم:۸۴۳۹)

جس بندے میں امانت کی قدر دانی نہیں، اس بندے کا ایمان ہی نہیں

اندازہ لگائیے کہ شریعت نے امانت کا کیا مقام بتا دیا ہے۔ اس لیے کہ اگر امانت میں خیانت آجائے تو پوری سوسائٹی اور مشورے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور شریعت نے اس چیز کو بہت زیادہ ناپسند کیا۔

بندگی کی امانت:

چنانچہ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ یومِ الست کو اللہ رب العزت نے اپنی بندگی کی امانت آسمانوں کے سامنے پیش کی، اس نے معذرت کر لی کہ یہ بوجھ اٹھانا میرے بس سے باہر ہے۔ زمین پر پیش کی اس نے بھی معذرت کر لی۔ پہاڑوں پر پیش کی اس نے بھی معذرت کر لی۔ انسانوں پر پیش کی اس نے قبول کر لی۔

یہ امانت کیا تھی؟ امانت یہ تھی کہ میرے بندو! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ میں تمہارا رب ہوں، میں تمہیں دنیا کے اندر پیدا بھی کروں گا اور پالوں گا بھی، تمہیں تمام صلاحیتوں اور نعمتوں سے نوازوں گا بھی۔ تمہیں اچھا اور برا کام کرنے کا اختیار بھی دوں گا لیکن میری نعمتیں جو تمہارے پاس ہوں گی تم ان نعمتوں کو میری مرضی کے مطابق استعمال کرنا، اپنی من مرضی نہ کرنا، اس کو بندگی کہتے ہیں۔ اور انسان اس بات پر تیار ہوگیا۔

زندگی ادھار کا مال ہے:

چنانچہ آج اللہ رب العزت نے جو بھی نعمتیں دی ہیں یہ ہماری اپنی نہیں ہیں۔ یہ ادھار کا مال ہے اور جو ادھار کے مال پر فریفتہ ہوا پھرے اسی کو دیوانہ کہا جاتا ہے۔ یہ جوانی ادھار کا مال ہے۔

مثال نمبر ۱:

آپ کسی بیرون ملک میں جاتے ہیں تو وہاں ایئرپورٹ پر سائن بنا ہوتا ہے (Rent a Car) کہ اگر آپ کو اس ملک میں گاڑی کی ضرورت ہے تو ''رینٹ اے کار'' آپ ایک کار کرائے پر لے سکتے ہیں۔ جب آپ نے وہ گاڑی لے لی دو دن کے لیے، تین دن کے لیے، وہ آپ کے پاس امانت ہے۔ آپ اپنی مرضی سے اس کا کام نہیں کروا سکتے، اس کا کلر نہیں بدل سکتے، آپ اسے Missuse (غلط استعمال) نہیں کر سکتے۔ اگر غلط استعمال کریں گے تو جب واپس کرنے جائیں گے، تو وہ آپ کو پکڑیں گے کہ جی ہماری گاڑی کو مس یوز کیوں کیا؟ کیونکہ وہ ہمیشہ کے لیے بھی آپ کی نہیں ہو جاتی بلکہ ایک محدود مدت کے لیے آپ کو دی جاتی ہے۔ اصل مالک کوئی اور ہوتا ہے مگر اسٹیئرنگ پر آپ کو بٹھا دیتے ہیں، آپ ڈرائیو کر سکتے ہیں۔

اب اس پر بیٹھ کر آپ چاہیں تو کسی کلب میں جائیں، چاہیں تو کسی مسجد میں جائیں، اتنا اختیار آپ کے پاس ہے۔ گاڑی چلے گی لیکن جب مدت ختم ہوگی تو گاڑی واپس ہو جائے گی۔ یوں سمجھیں کہ ہمارا جسم ایک کرائے کی گاڑی کی مانند ہے۔ اللہ رب العزت نے ہمیں اس گاڑی کا ڈرائیور بنا دیا، تم ان ہاتھوں کو استعمال کر سکتے ہو، آنکھوں کو استعمال کر سکتے ہو، زبان کو استعمال کر سکتے ہو، پاؤں کو استعمال کر سکتے ہو، مگر ساتھ حکم دے دیا کہ میرے بندو! میرے حکموں کا خیال رکھنا۔ اگر میری ہدایت کے مطابق استعمال کرو گے تو میں تمہیں انعام دوں گا اور اس کے خلاف استعمال کرو گے تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ تو بات تو سمجھ آنے والی ہے۔ اب بتائیں کہ ہم اپنے جسم کے مالک نہیں ہیں، مالک ہمارا پروردگار ہے، یہ ملک اس کی ہے۔

مثال نمبر ۲:

اچھا ایک آسان مثال دیکھیں! آپ کو مکان کی ضرورت ہے، کرائے پر مکان لے لیتے ہیں۔ اب مکان کا مالک کوئی اور ہوتا ہے اور آپ کرائے دار ہیں۔ مالک دیکھتا رہتا ہے کہ آپ مکان کو Well Maintain (صحیح دیکھ بھال) کرتے ہیں کہ نہیں کرتے۔ اگر وہ دیکھے کہ مکان میں بچوں نے جگہ جگہ دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا، اس کا جو لان بنا ہوا تھا اس کے پودے مرجھا رہے ہیں، کوئی خیال نہیں کرتا۔ فوراً نوٹس ملے گا کہ جی اگلے مہینے میرا مکان خالی کر دیجیے! آپ میرے مکان میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ تو کرائے کا مکان اگر اس کے مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے تو مالک اس مکان سے نکال دیتا ہے۔ آپ اگر کہیں کہ جی مجھے ایک مہینے کے لیے مزید رہنے دیں وہ کہے گا کہ سوچیں بھی نہیں اس بارے میں۔ اللہ رب العزت نے ہمارے ساتھ اسی طرح معاملہ کیا۔ میرے بندو! تمہیں نعمتیں دیتا ہوں ایسی نعمتیں جو کوئی دوسرا دے نہیں سکتا۔ مگر تمہارا اختیار محدود مدت کے لیے ہے،

تم ذرا مجھے اس گاڑی کو چلا کے دکھاؤ! اگر صحیح طریقے سے چلاؤ گے تو انعام پاؤ گے اور غلط چلاؤ گے تو سزا پاؤ گے۔

ہم نے اللہ رب العزت سے یہ عہد کر لیا ''یوم الست'' میں فرمایا:

﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا بَلٰى﴾

''کیا میں تمہارا رب نہیں؟ کہا: بالکل آپ ہمارے رب ہیں''

بلٰی کے الفاظ کے ساتھ ہم نے اپنے رب سے یہ وعدہ کر لیا۔ اب ہم اس بات کے پابند ہیں، اپنی زندگی شریعت اور سنت کے مطابق گذاریں۔

مثال نمبر۳:

اس کی ایک اور مثال سن لیجیے۔ فرض کریں ایک باپ بڑا امیر ہے، بلینئر ہے۔ اس کا ایک ہی بیٹا ہے، وہ اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ بیٹے میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر کا کاروبار کر کے دیتا ہوں مگر میں دیکھوں گا کہ تم کاروبار کو کرتے کیسے ہو؟ چلاتے کیسے ہو؟ اگر تم نے صحیح طریقے سے میری ہدایت کے مطابق چلا لیا، بیٹے میں اپنے سارے کاروبار کا جانشین اور مالک تمہیں بنا دوں گا اور اگر میں نے دیکھا کہ تم اس چھوٹے سے کام کو بھی نہیں سنبھال سکے تو پھر تم اس قابل ہی نہیں کہ میں یہ سب کچھ تمہارے حوالے کر دوں۔ بالکل یہی اللہ رب العزت کا معاملہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے بندو! میں تمہیں دنیا میں نعمتیں دے رہا ہوں، استعمال کر کے دکھاؤ، اگر تم نے میری مرضی کے مطابق ٹھیک استعمال کر لیں تو جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہیں یہ نعمتیں بہت بڑھا کر واپس کر دوں گا۔ اور اگر تم نے ان کو غلط استعمال کیا، مس یوز کیا، تو میں اپنی امانت واپس لے لوں گا اور تمہیں واپس کبھی بھی نہیں لوٹاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں:

چنانچہ بچہ جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کو اللہ کی نعمتیں ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔

پہلے منہ میں دانت نہیں تھے، اب منہ میں دانت آ گئے۔ پہلے اس کی عقل پختہ نہیں تھی وقت کے ساتھ ساتھ عقل پختہ ہونی شروع ہو گئی۔ بولنے کی سکت نہیں تھی، جانتا نہیں تھا، آہستہ آہستہ بولنا شروع کر دیا، سمجھنا شروع کر دیا۔ پھر بچہ تھا، اللہ نے نوجوان بنا دیا، بھرپور جوانی کی زندگی عطا فرما دی۔ اب کچھ وقت ایسا گزرتا ہے، ہر انسان کی زندگی میں کہ وہ بیس پچیس سے لے کر چالیس پچاس تک بھرپور جوانی کی زندگی گزارتا ہے۔

نعمتوں کی واپسی:

اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس بندے نے اپنی پچ پہ کھیل لیا۔ جو اس نے سکور بنانے تھے وہ بنا لیے۔ اب اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ اس سے نعمتیں واپس لینا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دانت میں Cavity (کھوڑ) بن گئی، نعمت واپس جا رہی ہے۔ دوسرے دانت میں کیویٹی بن گئی Dentist (دانتوں کے ڈاکٹر) نے کہا جی دانت نکالنا پڑے گا، اس کی جو Root (جڑیں) ہیں اس کی Treatment (علاج) نہیں ہو سکتی، دانت نکل گیا، نعمت واپس جا رہی ہے۔ پہلے نظر سکس بائی سکس تھی اب ذرا قریب کی نظر میں کمزوری آ گئی، عینک لگ گئی، نعمت واپس جا رہی ہے۔ بھرپور جوانی تھی، تھکتا ہی نہیں تھا، تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، اب تھوڑی سی مشقت اٹھائے تو سانس چڑھ جاتا ہے، نعمت واپس جا رہی ہے۔ ایک وقت تھا، جو کھاتا تھا، ہضم ہو جاتا تھا، اب ہاضمہ اتنا قوی نہیں رہا، نعمت واپس جا رہی ہے۔ بال سفید آ گئے، نعمت واپس جا رہی ہے۔ پہلے ایسی نیند آتی تھی کہ جگانے والے تھک جاتے تھے، اس کی نیند ختم نہیں ہوتی تھی اب کروٹیں بدلتا رہتا ہے، نیند کی منتیں کرتا ہے نیند نہیں آتی، نعمت واپس جا رہی ہے۔ اب اس کے بلڈ پریشر اوپر نیچے ہو گئے، نعمت واپس جا رہی ہے۔ اب اس کی آرٹریز بند ہو گئیں، نعمت واپس جا رہی ہے۔ اب اس کے اندر یادداشت وہ

نہیں رہی، بھول جاتا ہے، نعمت واپس جارہی ہے۔ایک وقت آتا ہے کہ بندہ سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا، کمر جھک گئی، نعمت واپس جارہی ہے۔موت ان تمام نعمتوں کے کامل طور پر چھن جانے کا دوسرا نام ہے۔نعمت آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے۔ایک وقت آتا ہے کہ موت آجاتی ہے۔موت کے وقت اللہ تعالیٰ ساری نعمتیں بندے سے لے لیتے ہیں، ساری نعمتیں چھن گئیں۔

نعمتوں کا حساب:

اب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو کھڑا فرمائیں گے اور اس کا حساب لیں گے کہ بتاؤ بھئی! تم نے میری Rent (کرائے) کی چیزوں کو کیسے استعمال کیا۔

بینائی کی نعمت کا حساب:

تمہاری آنکھ غیر محرم کو دیکھتی تھی، تم اس قابل نہیں کہ تم جنت میں آؤ اور میرا دیدار ان آنکھوں سے کرسکو۔اب جہنم میں بھیجیں گے، وہاں جہنم کے فرشتے آگ کے اندر گرم کیے ہوئے نیزے انسان کی آنکھوں میں چبھوئیں گے اور کہیں گے آنکھ کو Misuse (غلط استعمال) کیا تھا نا! بنائی چلی گئی، اب بنائی نہیں ملے گی۔

عجیب بات سنیے، جب انسان قیامت کے دن کھڑا ہوگا تو اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اندھیرا ہوگا مؤمن کے اوپر روشنی ہوگی۔

﴿ نُورُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ﴾

لیکن کافروں اور منافقوں پر کوئی روشنی نہیں۔ ایمان والوں کو کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف توجہ فرمائیے۔

﴿ نَقْتَبِسْ مِنْ نُوْرِكُمْ ﴾

''ہم تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں''

﴿قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾

''کہا جائے گا واپس جاؤ دنیا میں یہ روشنی تو وہاں ملا کرتی تھی''

تو قیامت کے دن اندھیرے میں کھڑا ہوگا۔ جب اس بندے کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو جہنم کی آگ دنیا کی آگ کے برخلاف روشنی نہیں دیتی۔ دنیا کی آگ جہاں زیادہ ہو، روشنی زیادہ ہوتی ہے، جہنم کی آگ زیادہ ہو تو وہاں اندھیرا زیادہ ہوتا ہے۔ پرائمری سکول میں سائنس کی کتاب میں شعلے کے حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس میں جو روشن حصہ ہوتا ہے، وہ کم گرم ہوتا ہے۔ جو سب سے زیادہ گرم ہوتا ہے وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور نیلے کے بعد ایک حصہ ہوتا ہے جو نظر ہی نہیں آتا، وہ اس سے بھی زیادہ گرم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ جہنم کی آگ اتنی گرم ہوگی کہ نظر ہی نہیں آئے گی۔ گھپ اندھیرا...... نبی ﷺ نے فرمایا کہ جہنم کی آگ جتنی زیادہ ہوگی وہاں اتنا زیادہ اندھیرا ہوگا۔ اب جہنم میں گیا تو وہاں بھی اندھیرا۔ آنکھوں کا غلط استعمال کیا موت کے وقت بینائی چھن گئی۔ اب یہ اس کو جہنم کی آگ کے اندر بھی نہیں ملے گی۔

شنوائی اور گویائی کی نعمت کا حساب:

دنیا میں اللہ رب العزت نے اسے سننے کی نعمت عطا فرمائی، اب یہ اس سے موسیقی سنتا تھا، لوگوں کی غیبتیں سنا کرتا تھا، ان کانوں سے یہ گانے سنا کرتا تھا، تو موت کے وقت اس سماعت کو چھین لیں گے اور پھر جہنم میں بھیجیں گے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کھڑا کریں گے۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾

''اندھا بھی ہوگا، گونگا بھی ہوگا، بہرا بھی ہوگا''

کیا مطلب؟ یہ بینائی واپس لے لی، یہ سماعت واپس لے لی، یہ نعمت واپس لے لی، تم میری نعمت کو مس یوز کرتے رہے، تم اس قابل ہی نہیں کہ یہ تمہیں اب ملے۔

کھانے کی نعمت کا حساب:

دنیا میں اللہ نے کھانے کی نعمت عطا فرمائی۔ اگر ایک آدمی حرام حلال کا خیال نہیں کرتا، موت کے وقت یہ نعمت لے لی جائے گی، اب اسے کھانے کو نعمتیں نہیں ملیں گی۔ قیامت کے دن جب پتہ چلے گا کہ حرام کھاتا تھا، رشوت لیتا تھا، سود کھاتا تھا، دھوکے کے پیسے کھاتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں بھیجیں گے۔ وہاں پر بھوک ہوگی لیکن جب کھانے کے پیسے مانگے گا تو روٹی نہیں ملے گی، بریانی نہیں ملے گی، آئس کریمیں نہیں ملیں گی، فرمایا:

﴿اِنَّ الشَّجَرَةَ الزَّقُّوْمَ طَعَامُ الْاَثِیْمِ﴾

''زقوم کا درخت یا پودا یہ گناہ گاروں کی خوراک ہوگا''

یہ وہ ہوتا ہے کہ جس کے اوپر کانٹے بھی ہوتے ہیں اور وہ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ صبح کے وقت زبان پر لگائیں تو شام کے وقت تک کڑواہٹ نہیں جاتی۔ یہ کھائے گا لیکن یہ جب کھائے گا تو حلق کے اندر وہ کانٹے پھنسیں گے کہ نہ نگلتے بنے گی، نہ اگلتے بنے گی۔ اب یہ پانی مانگے گا تو پانی میں اس کو جامِ شیریں نہیں ملے گا، روح افزا نہیں ملے گا، کیا ملے گا؟ قرآن مجید سے پوچھیے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے بندے کو۔

﴿وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنَ لَا یَاْکُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ﴾

جہنمی لوگوں کے زخموں سے جو خون اور پیپ بہے گی، اس کو Collect کر کے، جمع کر کے، گرم کر کے پینے کے لیے پیالے میں دیں گے۔ آج کہیں پھوڑا ہو تو جب اس پر مرہم لگانے لگتے ہیں تو بو برداشت نہیں ہوتی۔ اس پیپ کو جہنم میں پینا پڑے گا اور اتنی پیاس ہوگی کہ وہ اسے پیئے گا۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ بندہ جب پیئے گا تو کیا ہوگا؟ اس کے اندر کی ساری آنتیں کٹ کے اس کے پاخانے کے راستے سے نیچے نکل آئیں گی۔ یہ کھانا ہوگا، یہ پینا ہوگا۔

لباس کی نعمت کا حساب:

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے لباس کی نعمت عطا فرمائی۔ میرے بندو! شریعت کے مطابق لباس پہنو! اگر کسی کو فرنگی کے طریقے پسند ہوں اور ان جیسا لباس پہنے

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (ابی داؤد، رقم: ۳۵۱۲)

نمائش کا لباس پہنے، دکھاوے کا خلافِ شرع لباس تو یہ لباس کی نعمت چھن جائے گی۔ اب قیامت کے دن جب پتہ چلے گا کہ اس نے خلافِ شرع لباس پہنے تھے تو پھر پتہ کیا ہوگا؟ جہنم میں اس کو بھیجیں گے تو وہاں اس کو ایک یونیفارم ملے گی، قرآن مجید میں فرمایا:

﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ﴾ "گندھک کا بنا لباس ہوگا"

سلفر کا بنا ہوگا۔ فقہا نے لکھا کہ اگر ساری دنیا کے انسان، درندے، پرندے، خشکی کی مخلوق، تری کی مخلوق، سب ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ سب کو موت آ جائے سب کی لاشیں گل سڑ جائیں، اس جگہ پر اتنی بدبو نہیں ہوگی جتنی بدبو جہنمی کے کپڑوں کے اندر ہوگی۔ تو نے میری نعمت کو Misuse (غلط استعمال) کیا اب تو اس قابل ہے؟

گھر کی نعمت کا حساب:

اس دنیا میں اللہ نے مکان دیا، یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اب گھر میں چینل لگوا لیا، کیبل لگوا لی، انٹرنیٹ کا کنکشن گھر کے اندر، وی سی آر چل رہے ہیں، سکرین کے تماشے دیکھے جا رہے ہیں، گانے والیوں کی آوازوں سے گھر گونج رہا ہے، موت کے وقت یہ نعمت لے لی جائے گی۔ پھر یہ نعمت نہیں ملے گی۔ قیامت کے دن جب پتہ چلے گا کہ یہ نعمت کو مس یوز کرتا تھا تو اس کو جہنم بھیجا جائے گا۔ اب جہنم میں اتنا چھوٹا سا گھر ہوگا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَكَانًا ضَيِّقًا﴾ ''اتنا تنگ مکان ہوگا''

﴿دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا﴾

وہاں پر یہ موت مانگے گا

اللہ اس جگہ رہنے سے تو موت بہتر ہے:

کہا جائے گا

﴿لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا﴾

ایک موت نہ مانگو کئی موتیں مانگو!

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شہوت کے غلط استعمال کا نتیجہ:

اللہ رب العزت نے انسان کو دنیا میں جنسی شہوت کی نعمت عطا فرمائی، یہ نسل کی بقا کا ذریعہ ہے مگر حکم دیا کہ اس کو تم نے صحیح طریقے سے استعمال کرنا ہے۔ اگر غلط طریقے سے استعمال کیا اور توبہ کیے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تو قیامت کے دن پھر جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اور وہاں کیا ہوگا؟ حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ ایک غار ہو گا۔ اس میں اس بندے کو دھکیل دیا جائے گا اور دروازہ بند کر دیا جائے گا اور اس غار کے اندر بچھو ہوں گے اور ان بچھوؤں کا ڈنگ اتنا بڑا ہوگا کہ دنیا کے ایک اونٹ کے بقدر ہوگا۔ وہ اس کے جسم کے ہر حصے پر اس طرح چڑھ جائیں گے جس طرح شہد کے چھتے پر شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ اتنے بچھو ایک وقت میں ڈسیں گے۔ اللہ اکبر کبیرا! یہ سزا کیوں ملے گی؟ اس لیے کہ اس نے ایسا گناہ کیا کہ اس کے جسم کے ایک ایک ٹشو نے انجوائے کیا تھا۔ آج ایک ایک ٹشو میں یہ پوائزن جائے گی اور ہم اس کو سزا دیں گے۔ ایک بھڑ کاٹ لے، شہد کی مکھی کاٹ لے، تو چین نہیں آتا اور اگر ایک بچھو کاٹ

لے تو کئی دن روتے گزرتے ہیں۔ جب اتنے بچھو کاٹیں گے تو سوچیں پھر کیا ہوگا؟

تو ہمارے پاس اللہ کی یہ نعمتیں ہیں۔ بالفرض ایک ایسا بندہ ہے جس نے زندگی شریعت اور سنت کے مطابق گزاری، قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا پتہ چلے گا کہ یہ غیر محرم سے بچتا تھا، آنکھوں کو بچاتا تھا، نگاہیں نیچی رکھتا تھا، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو صحیح استعمال کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کو جنت بھیجیں گے اور اس کو ایسی بینائی عطا فرمائیں گے جس بینائی کے ساتھ یہ انبیا کا دیدار کرے گا، اپنے پروردگار کا دیدار کر سکے گا۔ ایسی آنکھیں دیں گے، اللہ دنیا میں یہ بندہ اپنے کانوں کو صحیح استعمال کرتا تھا اللہ کا قرآن سنتا تھا، نبی علیہ السلام کی نعت سنتا تھا، وعظ ونصیحت سنتا تھا، خیر کی باتیں سنتا تھا، غیبت سے بچتا تھا اور اس قسم کے گناہوں سے بچتا تھا اور اس قسم کے گناہوں سے بچتا تھا۔

قیامت کے دن اگر ثابت ہو گیا کہ اس بندے نے کان کی اس نعمت کو صحیح استعمال کیا تھا، اللہ تعالیٰ اس بندے کو جنت بھیجیں گے اور یہ نعمت بڑھا کر اس کو واپس دیں گے۔ کیسے بڑھائیں گے؟ ایسی سماعت عطا فرمائیں گے کہ جنت میں جب اس کو اللہ کا دیدار ہوگا، جنت عدن میں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سورۃ یٰسین کی تلاوت فرمائیں گے، جنتی اپنے کانوں سے اس تلاوت کو سنیں گے۔

یہ بندہ دنیا میں حلال کھاتا تھا، قیامت کے دن ثابت ہو گیا کہ ہاں حلال کا اہتمام کرتا تھا، اب اللہ رب العزت جنت میں بھیجیں گے اور جنت کے ایسے کھانے عطا فرمائیں گے، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ وہ اس قدر لذیذ ہوں گے اس قدر اچھے ہوں گے کہ جب دنیا کے کھانوں کو یاد کرے گا تو اس بندے کو گھن آیا کرے گی کہ میں دنیا میں یہ کھاتا تھا۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کتابوں میں لکھا ہے کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا

ہے تو وہ پانی کے اندر فلوٹ کر رہا ہوتا ہے۔ گویا پیشاب کے اندر وقت گزار رہا ہوتا ہے۔ اب آج اگر کسی کو کہیں کہ تم نے اپنی زندگی کے نو مہینے پیشاب کے اندر گزارے کتنی کراہت ہوتی ہے! آج ماں کے بدن کی کیفیت کو سوچ کر کراہت ہوتی ہے، جنتی کو دنیا کے کھانوں کے بارے میں سوچ کر ایسی کراہت ہوا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے کھانے عطا فرمائے گا۔

اگر پتہ چل گیا کہ ایک آدمی اپنی زبان کو صحیح استعمال کرتا تھا، تلاوت کرتا تھا، دین کی دعوت کا کام کرتا تھا، خیر کی بات کرتا تھا، نصیحت کی باتیں کرتا تھا، اللہ رب العزت اسے جنت میں بھیجیں گے اور ایسی زبان عطا فرمائیں گے کہ یہ جنت میں جا کر انبیائے کرام سے ہم کلامی کیا کرے گا۔

دنیا میں یہ اپنے کپڑے شریعت اور سنت کے مطابق بناتا تھا، ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھیجیں گے اور جنت میں اس کو جنتی لباس پہنائیں گے مرد ہو گا تو ریشم کا لباس اور عورت ہو گی تو ایسا لباس حدیث پاک میں آتا ہے کہ جنتی عورت کے لباس میں سے ستر ہزار رنگوں کی جھلک آیا کرے گی، دنیا میں سات رنگ ہیں ان کے کتنے شیڈ بن سکتے ہیں چند ایک۔ چند شیڈ دنیا میں ہیں ان سے اتنے خوبصورت کپڑے بنتے ہیں آج، عورتیں فریفتہ ہوتی ہیں دیکھ کے مجھے تو ضرور لینا ہے اللہ تعالیٰ جنت میں ایسا لباس دیں گے کہ ستر ہزار رنگوں کے شیڈ اس میں جھلکا کریں گے۔

دنیا میں مکان تھا اپنے مکان میں یہ نماز پڑھتا تھا، یہ گھر والوں کو نماز پڑھاتا تھا یہ اس نے اپنے گھر کو سنت کا گلشن بنا دیا تھا، سنتوں کا باغ بنا دیا تھا، تقویٰ سے سجا دیا تھا، نیکی کے نور سے اس نے اپنے گھر کو بھر دیا تھا۔ موت کے وقت اسے یہ نعمت دی جائے گی قیامت کے دن پتہ چل جائے گا کہ اس نے اللہ کی نعمت کو یوز (استعمال) کیا تھا، مس یوز نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں بھیجیں گے اور جنت میں سرخ

یا قوت کا بنا ہوا محل، ایک ہیرے اور ایک موتی کا بے جوڑ بنا ہوا محل، سونے چاندی کی اینٹوں اور مشک وعنبر کے گارے سے بنا ہوا محل اس کو عطا فرمائیں گے اور وہ گھر کتنا بڑا ہوگا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو آخری جنتی جنت میں جائے گا، اس کا گھر زمین اور آسمان کے خلا سے دس گنا زیادہ بڑا ہوگا۔۔

تو معاملہ تو سمجھ میں آنے والا ہے کہ آج جو اللہ رب العزت نے ہمیں یہ بینائی دی، ہم نے کون سا اس کا ٹیکس بھرا ہوا ہے؟ ہم کون سا اس کی Maintenance (مرمت و دیکھ بھال) کرتے ہیں۔ ایسی آنکھ دی کہ پوری زندگی انسان کی آنکھ کام کرتی رہتی ہے۔ اور اگر کبھی بیمار ہوتے ہیں تو اکثر ہماری اپنی کوتاہیاں ہوتی ہیں ورنہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ملے کہ جن کی عمر ایک سو سال سے زیادہ تھی اور انہوں نے کبھی ایک گولی بھی نہیں کھائی۔ بلکہ ہمارے ایک قریبی بزرگ شاید مجمعے میں بھی موجود ہوں جنہوں نے حضرت فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی ساٹھ سال خدمت کی۔ پچھلی دفعہ تشریف لائے تو بتانے لگے کہ میری عمر سو سال سے زیادہ ہوگئی ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے 1884ء کی باتیں تو یاد ہیں۔ ماشاء اللہ۔ اور کہنے لگے کہ اتنی زندگی میں نے آج تک ڈاکٹر کی گولی کبھی نہیں کھائی۔ ہم اکثر و بیشتر بیمار ہوتے ہیں تو اپنی بد پرہیزیوں کی وجہ سے۔

اللہ نے دل ایسا دیا۔ دنیا کے پمپ ہوتے ہیں سال کے بعد بیرنگ خراب، سال کے بعد شافٹ بیرنگ پر ڈھیلی ہو جاتی ہے اور اس کے اندر پلے آجاتی ہے۔ پھر کہتے ہیں یا تو اس کی Maintenance (مرمت) کراؤ یا نیا خریدو! میرے اللہ نے دل کا پمپ بنایا، اب اس کی عمر سو سال سے زیادہ ہو جائے تو بھی چلتا ہے۔ نان سٹاپ 24 گھنٹے چلتا ہے۔ مرمت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیسی نعمت اللہ نے عطا فرمائی! ہم نے اس کے کوئی پیسے تھوڑے دیے، بن مانگے اللہ نے یہ نعمتیں دیں۔ تو ہمارے پاس جو یہ سب کچھ ہے یہ ہمارا اپنا نہیں، یہ ادھار کا مال ہے اور جو ادھار کے

مال پہ فریفتہ ہوا پھرے اسی کو دیوانہ کہا کرتے ہیں۔

آج جوانی مستانی یہ سیلاب ہر ایک پر چڑھتا ہے لیکن اترنے کا پتہ نہیں چلتا۔ اچھا آپ بتائیں کبھی کسی کو پتہ چلا کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر میرے اوپر بڑھاپا آگیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا بڑھاپا آجاتا ہے۔ ہم نے حج کے موقعہ پر ایک بڑے میاں سے پوچھا کہ بڑے میاں کیا حال ہے؟ کہتے ہیں کہ روکنے کی کوشش تو بڑی کی، رکا نہیں۔ ہم نے پوچھا: کیا؟ اس نے کہا: بڑھاپا۔ اس کو روکنے کی کوشش تو بہت کی رکا نہیں۔ تو یہ بڑھاپا تو ایسی چیز ہے کہ آجاتا ہے۔ آج دیکھو! اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کتنی نعمتیں ہمارے پاس ہیں۔

دنیا کردار بننے کی جگہ ہے:

اچھا جس بندے کی پیدائش ہوئی اور اس کی آنکھیں نہیں تھیں تو کیا دنیا کے ڈاکٹر مل کر آنکھیں بنا سکتے ہیں؟ نہیں بنا سکتے۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر مل جائیں جی بچے کی آنکھیں بنا دیجیے، کہیں گے کہ اگر ماں کے پیٹ سے یہ بچہ بغیر آنکھوں کے آیا، دنیا میں نہیں بنا سکتے۔ جس طرح ماں کا پیٹ انسان کے بننے کی جگہ ہے، اگر کوتاہی رہ گئی تو دنیا میں آکر پوری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح زمین آسمان کا پیٹ انسان کی شخصیت بننے کی جگہ ہے، کردار بنانے کی جگہ ہے۔ جس کی شخصیت میں یہاں کمی رہ گئی وہ قیامت کے دن جا کے پوری نہیں ہوسکتی۔ ہم نے اپنی شخصیت کو یہاں بنانا ہوگا، اپنے اندر اخلاق کو یہاں بنانا سنت ہے۔ اپنے آپ کو یہاں سجانا ہوگا ورنہ قیامت کے دن یہ نعمت نہیں ملے گی، کہیں گے: جاؤ! یہ نعمت تو دنیا میں ملا کرتی تھی۔

تھوڑے وقت میں زیادہ کام:

ایک عام دستور کی بات ہے کہ آدمی کو ادھار کی چیز ملے تو وہ تھوڑی دیر میں زیادہ

کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے صبح اٹھ کر دفتر جانا ہے، بیوی نے کپڑے استری کرنے شروع کیے اور استری خراب ہوگئی۔ اب کیا کیا جائے نئی تو بازار سے اتنی جلدی آنہیں سکتی، وہ جو ساتھ آپ کے بھائی کا گھر ہے، ان سے بچے کے ذریعے سے منگوائے گی۔ اگر وہ استری دے دیں گے تو وہ آپ کے ہی کپڑے استری نہیں کرے گی بلکہ ساتھ اپنے بھی کرلے گی اور بچوں کے بھی کرلے گی۔ ایک دن کے نہیں دو چار دنوں کے کرلے گی۔ کہے گی: ہوسکتا ہے کہ آنے میں دیر لگ جائے، بار بار تو چیز نہیں مانگی جاتی۔ معلوم ہوا کہ ادھار کی چیز سے تھوڑے وقت میں زیادہ کام نکالا جاتا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اس ادھار کے مال سے مختصر زندگی میں زیادہ اعمال نکالنے کوشش کرے اور ہمارے اکابر یہی کیا کرتے تھے دن رات اپنے جسم کو تھکا دیتے تھے، نیکی کر کر کے تھکتے تھے اور تھک کر پھر نیکی کرتے تھے۔

ایک بزرگ تھے ستر سال ان کی عمر تھی، اس عمر میں روزانہ ستر طواف کرتے تھے۔ ہر طواف کے سات چکر ہوتے ہیں اور ہر طواف کی دو رکعت واجب الطواف نوافل بھی ہوتے ہیں۔ تو ستر طواف کی رکعتیں بنیں ایک سو چالیس۔ ہم اگر کچھ نفلیں پڑھ لیں ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟ میں اپنے دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ رمضان کی کسی رات میں ہمت کرلیں کہ جی آج دس بیس رکعتیں پڑھنی ہیں تو بیس رکعت پڑھنے کے بعد ہمارا یہ حال ہوتا ہے کہ رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ کی جگہ اوئی اللہ نکل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو ہماری جوانیاں ہیں اور بیس رکعت پڑھنے پر یہ حال، وہ ایک سو چالیس نفل صرف طواف کے پڑھتے تھے اور باقی پورے دن کے اعمال اس کے علاوہ۔

ایک مرتبہ عمرے کے سفر میں ہم نے سب جماعت کے دوستوں کو مردوں عورتوں کو ترغیب دی کہ بھئی کوشش کریں زیادہ سے زیادہ طواف کرنے کی۔ پندرہ دن کا قیام ہوتا ہے اس میں پانچ دن چلو مدینہ طیبہ میں گزریں گے، دس دن تو مکہ مکرمہ کے ہیں۔ تو

بھی دس دن میں ستر طواف ہی سہی۔ کچھ نوجوان بچوں نے اور بچیوں نے طواف کرنے کے ارادے کر لیے۔ سو آدمیوں سے زیادہ کا گروپ تھا، شاید ایک یا دو بچوں نے دس دنوں میں ستر طواف مکمل کیے اور جنہوں نے ستر طواف مکمل کیے وہ آ کر کہنے لگے کہ دعا کر دیں پاؤں کے نیچے چھالے بن گئے ہیں۔ دس دن میں ستر طواف کیے تو چھالے بن گئے، وہ ایک دن میں ستر طواف کرتے تھے۔ تو دیکھا کہ ہمارے بزرگوں نے تھوڑے وقت میں زیادہ کام نکالا، ہے نا یہی بات۔ اگر ہمیں سمجھ میں آ جائے ہم زندگی کے کسی وقت کو خالی نہ رہنے دیں، اللہ کرے ہمیں وقت کی قدر آ جائے۔

گناہ بھی خیانت ہے:

تو دیکھیے امانت کا مفہوم شریعت کی نظر میں بہت وسیع ہے۔ اب کوئی یہ کہے کہ جی یہ چیزیں کہاں سے امانت ہیں؟ تو دلیل قرآن عظیم الشان میں سے۔ ایک آدمی اگر غیر محرم کی طرف دیکھتا ہے تو اس نے اللہ کے حکم کو توڑا نا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

((يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ))

''جانتا ہے آنکھ کی خیانت کو اور جو تم چھپاتے ہو''

تو گناہ کو اللہ تعالیٰ نے خیانت کے لفظ سے تعبیر کیا کہ غیر کی طرف دیکھنا خیانت ہے تو معلوم ہوا کہ ہر گناہ کو کرنا خیانت ہے۔ امانت میں اگر یوں دیکھیں تو ہم تو روزانہ خیانت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ روزانہ کوئی زندگی کا دن ایسا ہوگا کہ ہم نے گناہ نہ کیا ہو؟ ہم زندگی کا کوئی دن گن سکتے ہیں کہ صبح سے لے کر شام تک ہم نے جسم کے عضو سے کوئی بھی گناہ نہ کیا ہو؟ بہت کم لوگ ہوں گے۔ الا ما شاء اللہ۔ وگرنہ کہیں نہ کہیں زبان سے خطا ہو گئی، آنکھ نے غلط دیکھ لیا، کان سے سن لیا، کوئی نہ کوئی ایسا معاملہ ہو گیا، تو خیانت کے تو پھر روز ہی مرتکب ہو رہے ہیں۔

موبائل فون کی تباہ کاریاں:

اور آج ایک نئی مصیبت آگئی ،تاریخِ انسانیت میں شیطان کے ہاتھ میں اتنا Mass Destrective Weapon (تباہ کن ہتھیار) کبھی نہیں آیا۔ تھا چھوٹا سا ہے، جیبوں میں آجاتا ہے۔ اس مصیبت کا نام ہے سیل فون، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا نام ہے ہیل فون۔ یہ جہنم میں جانے کا سبب ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضرورت کے لیے ہے۔ اور شیطان نوجوانوں سے اس کا غلط استعمال شروع کروا دیتا ہے۔ اور چونکہ اس کے پیچھے کافر موجود ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نسل خراب ہو۔ لہٰذا ان کمپنیوں نے سہولیات دے دیں کہ جی رات کو کال فری ہے۔ اور بڑے بڑے بینر بنا دیے کہ ''کرو بات ساری رات'' اب جس قوم کے بچے ساری رات ایک دوسرے سے گناہ بھری باتیں کریں گے، وہ صبح اٹھ کر سکولوں کالجوں میں کیا کریں گے؟ اور یہ عام شکایت ہے، سکولوں کالجوں کے پروفیسر اکثر بتاتے ہیں کہ پوری کلاس سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ جس بچے کو دیکھو اسی کے ہاتھ میں فون۔ پہلے تو کچھ رکاوٹ تھی کہ ماں باپ خرچہ دیں گے تو اس میں کچھ کریڈٹ ڈالا جائے گا، نئی مصیبت آگئی کہ فون کسی کا کریڈٹ کوئی بھیج رہا ہے، ایزی لوڈ نے گناہ کے راستے آسان کر دیے۔ ماں باپ کو پتہ بھی نہیں، نوجوان بچے ایک دوسرے کے اکاؤنٹ میں پیسے بھیج رہے ہیں۔

ہمارے پاس ایک ایسی مثال آئی کہ ایک بچی کے پاس چار سال سے فون تھا اور اس کے ماں باپ کو اس کا پتہ بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس فون ہے۔ چار سال سے چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے تو فون بجتا تھا تو بیل آتی تھی، اب انہوں نے نئی مصیبت یہ ڈال دی کہ اس کو وائبریشن لگا دی۔ جیسے دل دھڑکتا ہے اسی طرح تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کا بھی دل دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس سیل فون کے ساتھ تو ہمیں اللہ کے لیے بغض ہونا چاہیے۔ ہاں بزنس کے لیے ضرورت ہے تو اتنا استعمال کریں جتنی ضرورت ہے، جیسے گھر میں چھری ہوتی ہے کہ بچوں کی پہنچ سے دور رکھتے ہیں، پہلے لوگ کہتے تھے:

Keep away from the reach of children.

اسی طرح اس کو بھی ایسی جگہ رکھو! جہاں سے یہ نظر بھی نہ آئے۔ اس کو بھی صرف ضرورت کیلیے استعمال کریں۔ ورنہ قیامت کے دن کروڑوں انسان ہوں گے جو اس آلے کو غلط استعمال کرنے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ کہیں ہمارا نام اس فہرست میں نہ آجائے۔ سوچنے کی بات ہے، اس مصیبت سے بچنے کی ضرورت ہے

نوجوان بچے ایک سے بات نہیں، درجنوں سے باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک جیسے فقرے درجنوں کو سنائے جا رہے ہیں، ایک جیسے میسج درجنوں کو کیے جا رہے ہیں۔ وقت ضائع، سکول کی تعلیم ضائع، گریڈ نہیں آتے بچوں کے، ماں باپ کہتے ہیں کہ جی بچوں کا دل نہیں لگتا۔ ان کا دل کیسے لگے؟ مصیبت جو آپ نے لے کے دی ہوئی ہے تو اس لیے یہ اللہ رب العزت کی نعمتوں کو مس یوز کرنا ہے۔ اب غیر محرم سے گھنٹوں باتیں کرنی، کانوں کا غلط استعمال، زبان کا غلط استعمال، تو یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ امانت کا مفہوم شریعت کی نظر میں بہت بڑا ہے۔

خودکشی حرام کیوں ہے؟

اب ذرا مسئلہ سنیے، ایک دوسری دلیل شریعت نے خودکشی کو کیوں حرام کہا؟ اب کوئی بندہ چاہے کہ میں خودکشی کرلوں، شریعت کہتی ہے کہ یہ حرام ہے، تم ایسا کام نہیں کر سکتے، کیوں؟ بھئی! اگر کرائے کے مکان میں رہتے ہو اور کہو کہ جی میں مکان گراتا ہوں تو مالک کیا کہے گا؟ تم ہوتے کون ہو گرانے والے؟ ہم اگر چاہیں کہ خودکشی کر لیں تو اللہ فرمائیں گے کہ تم ہوتے کون ہو خودکشی کرنے والے؟ جسم تو میرا دیا ہوا

ہے۔حتیٰ کہ اگر کوئی بندہ کسی کو لکھ کر دے دے کہ آپ مجھے قتل کر دیں تو شریعت کہتی ہے کہ بندے نے اجازت دے دی لیکن دوسرا اس کو قتل کر نہیں سکتا! کیوں؟ یہ مالک نہیں ہے، یہ تو یوزر ہے اس کا۔اس لیے شریعت نے خودکشی کو حرام قرار دیا کہ یہ ہمارے پاس ادھار کا مال ہے۔

جسم کا یوز اور مس یوز:

یہ جسم ایک امانت ہے ہم اس جسم کو اس طرح استعمال کریں جیسے ہمارا پروردگار چاہتا ہے۔اسی طرح اگر استعمال کریں گے تو پھر جب اللہ کے حضور جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے جنتی جسم عطا فرمائیں گے، من پسند کا حسن عطا فرمائیں گے۔ حدیث پاک میں ہے کہ جنت میں ایک بازار ہوگا، جنتی جائیں گے جیسے ان کا جی چاہے گا، ویسا ان کو حسن وہاں سے مل جائے گا، یہ جنت کا بیوٹی پارلر ہوگا۔

دنیا کے بیوٹی پارلر میں تو عورتیں جائیں بھی سہی تو جسم کے اوپر لیپ ہی مل سکتی ہیں اور کیا کر سکتی ہیں؟ نہ نقش نین بدل سکتی ہیں، نہ رنگ بدل سکتی ہیں، ڈسٹمپر ہی کر سکتی ہیں۔تو بیچاریاں ڈسٹمپر کر کے آجاتی ہیں اور پھر پھنس جاتی ہیں شادی میں، اب شادی میں نماز کا وقت ہوگیا تو یہ وضو کیسے کرے؟ راز کھل جائے گا کہ اوپر سے تو لگ رہی تھی حور اور اندر سے نکل آئی ڈین، لہٰذا نماز ہی نہیں پڑھتیں۔اگر دس گھنٹے بھی شادی کی تقریب میں رہنا پڑے تو اس دوران کی ساری نمازیں گئیں۔ہاں پہلے سے وضو کیا ہوا ہے تو پڑھنے والیاں، پڑھ لیں گی ورنہ مجبور ہیں کہ جی چہرہ دھوئیں کیسے؟ ان کے لیے چہرہ دھونا مصیبت ہوتی ہے۔

یہ تو دنیا کے مسئلے ہیں لیکن جنت میں تو ایسا نہیں ہوگا۔جنتی عورت جب بازارِ حسن پر جائے گی، حدیث پاک میں آتا ہے: سوچے گی کہ میری آنکھیں ایسی ہوں، ویسی بن جائیں گی۔میرا چہرہ ایسا ہو، ویسا بن جائے گا۔میرے رخسار ایسے ہوں، ویسے بن

جائیں گے۔ دانت ایسے ہوں، ویسے بن جائیں گے۔ ہونٹ ایسے، ویسے بن جائیں گے۔ سوچیے! تخیل میں جو خوبصورتی آئے گی، عورت سوچے گی، اللہ اپنی رحمت سے وہ نعمت عطا فرمائیں گے، کس لیے؟ یہ نعمتیں ملیں گی کہ یہ دنیا میں غیر محرم مرد سے بچتی تھی، اپنے آپ کو چھپاتی تھی، آج اس کو اختیار ہے، اس نے میری نعمت کا ٹھیک استعمال کیا، آج یہ میری اس نعمت کو جتنا چاہے حاصل کر لے۔ اگر اس Credeteria (شرائط) پر ہم اپنے آپ کو تولیں تو کیا ہم اللہ کی دی ہوئی نعمت کو یوز کر رہے ہیں یا مس یوز کر رہے ہیں؟ تو امانت کا تصور شریعت کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔

عاریتاً لی ہوئی چیزوں میں خیانت:

اچھا چلیں جسم سے باہر نکل کر بات کرتے ہیں، ہم دوسروں سے کوئی چیز عاریتاً لیتے ہیں وہ بھی امانت ہوتی ہے۔ اس کو بھی صحیح استعمال کرنا چاہیے اور آپ دیکھیں کہ ہم اکثر اوقات اس میں کوتاہی کرتے ہیں۔ مثلاً،

☆...... کسی نے کھانا برتن میں بھجوا دیا تو شریعت کہتی ہے کہ کھانا اپنے برتن میں ڈالو، ان کے برتن واپس بھیجو! ہم کھانا تو ڈال لیتے ہیں اور برتنوں کو اپنا سمجھ لیتے ہیں۔ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں، واپس نہیں بھیجتے۔ یہ عاریتاً دی ہوئی چیز کوئی ملکیت تو نہیں بن گئی۔ لینا یاد رہتا ہے، واپس دینا یاد نہیں ہوتا۔

کئی مرتبہ تو اس برتن سے وہ کام کرتے ہیں جو اپنے برتن سے نہیں کرتے۔ ہمارے ساتھی کہنے لگے کہ ہم ایک جگہ کہیں جماعت میں گئے تو ایک صاحب مجھ سے سلور کا لوٹا مانگ کے لے گئے، جب میں نے دوسرے دن لیا تو بالکل کالا، میں نے پوچھا کہ اسے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ چائے بنائی تھی۔ یہ بھی امانت میں خیانت۔

☆...... گاڑی کسی کی لیں گے عاریتاً۔ اپنی گاڑی چلاتے تھے تو زمین میں دیکھتے تھے

کہ کھڈے جہاں ہیں وہاں سے بچ کے گزرتے تھے۔ اب چونکہ یہ مانگی ہوئی گاڑی ہے لہٰذا کھڈے کے اوپر سے گزارتے ہوئے لے جارہے ہیں۔ یہ امانت میں خیانت ہے۔ ہم اس کو ایسے استعمال کریں جیسے اس کا مالک چاہتا ہے، غلط استعمال کریں گے تو پھر ہم اس کے جواب دہ بنیں گے۔

☆...... یہ باتیں تو شاید طلبا کو کم سمجھ میں آئیں، طلبا کی بات کرتے ہیں۔ کتاب پڑھنے کو مانگتے ہیں تو جب کوئی لے جائے تو آپ سمجھ لیں کہ بس یہ کتاب گئی۔ اکثر یہ بیماری دیکھی گئی کہ بڑی لجاجت سے مانگیں گے کہ پڑھ کر واپس کردوں گا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس ہاتھ سے لے کر پڑھیں گے اور دوسرے ہاتھ سے پڑھ کر واپس کر دیں گے۔ لیکن لینے کے بعد بھول جاتے ہیں، واپس کرنی یاد ہی نہیں رہتی، مہینوں گزر جاتے ہیں۔ بلکہ ایک طالب علم تو عجیب بات کرنے لگا کہ جی ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو اپنی کتاب کسی پڑھنے والے کو ادھار دے تو وہ بڑا بے وقوف اور جو ادھار لی ہوئی کتاب واپس کر دے وہ اس سے بھی بڑا بے وقوف ہے۔ اب اگر یہ صورت حال ہے تو پھر امانت میں خیانت کہاں گئی۔

یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں مگر اس سے ہماری Personality (شخصیت) کا اندازہ ہوتا ہے، ہمارے اندر ہماری زندگی میں امانت کا تصور ہے یا نہیں۔

ملازمت میں امانت کا تصور:

ذرا اور آگے بڑھیے! ہم جو ملازمت کرتے ہیں اور اس پر ہمیں تنخواہ ملتی ہے، پتہ ہے یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ مالک اور مزدور کے درمیان ایک ڈیل ہوتی ہے۔ مالک نے تنخواہ دینے کا وعدہ کیا، اس کے بدلے مزدور نے وقت بیچنے کا فیصلہ کیا۔ یہ عاجز جان بوجھ کر بیچنے کا لفظ استعمال کر رہا ہے تا کہ بات سمجھ میں آجائے۔ اب ہم نے آٹھ گھنٹے بیچ دیے۔ جب بیچ دیے تو یہ کس کے ہوئے؟ جو تنخواہ دیتا ہے اس کے ہوئے۔ تو پھر

ہم آج دفتروں میں جا کر کام کرتے ہیں یا گھروں کے کام کرتے ہیں کیا ہم آٹھ گھنٹے پوری مزدوری کرتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ اگر ہم ان آٹھ گھنٹے کو صحیح طرح مالک کے کہنے کے مطابق استعمال نہیں کریں گے تو رزق حلال کیسے بنے گا؟ یہ تو بیچا ہوا وقت ہے، یہ اب ہمارا نہیں ہے۔ ہم ڈیل کر چکے، اس کے بدلے تنخواہ لیتے ہیں۔

ایک نوجوان کی احتیاط:

چنانچہ ایک نوجوان سالک تھے، جب نوکری کرتے تھے تو ان کی ڈیوٹی فرض کرو آٹھ سے چار تھی۔ دن میں کئی مرتبہ ان کو دفتر کے کام کے لیے باہر جانا پڑتا۔ باہر کام کیا اور دیکھا کہ پونے چار ہو گئے تو پونے چار بجے وہ نوجوان چھٹی کر کے گھر نہیں آتا تھا کہ چار تو بجنے ہی والے ہیں، پونے چار دفتر کی طرف چلتا تھا، دفتر کا فاصلہ ہوتا آدھے گھنٹے کا تو آدھا راستہ گاڑی ڈرائیو کرنے کے بعد جب چار بجتے تب اپنے گھر کی طرف رخ کرتا تھا۔ جن کو رزقِ حلال کی فکر ہوتی ہے وہ اپنے ایک ایک لمحے کا حساب رکھتے ہیں کہ یہ میرا نہیں یہ کسی کا ہے۔

اکابر علمائے دیو بند کی احتیاط:

چنانچہ ہمارے اکابرین علمائے دیو بند کے اندر یہی احتیاط بہت واضح تھی۔ فرمایا کہ جب ان کے ہاں کسی استاد کو کوئی رشتہ دار ملنے آتا تھا، بعض دفعہ مجبوری ہو جاتی ہے تو جیسے ہی ملنے آتا، وہ اسی وقت ٹائم دیکھ لیتے، جب واپس جاتا تھا تو ٹائم دیکھ کر نوٹ کر لیتے کہ میرے رشتہ دار نے میرا کتنا وقت لیا۔ پورے مہینے میں یہ منٹ جمع کرتے کرتے گھنٹے بناتے، گھنٹوں کے دن بناتے، ایک دن یا دو دن، جب تنخواہ ملنے کا وقت ہوتا تھا تو اس وقت جو خازن ہوتا تھا اس کو بتاتے کہ یہ وقت میں پرسنل استعمال کیا ہے، لہٰذا میری تنخواہ میں سے اتنا پیسہ کم کر دیجیے

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط:

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ دس روپے تھی، دارالعلوم میں پڑھاتے پڑھاتے عمر گزر گئی، بڑھاپا آ گیا۔ مجلس شوریٰ کے اراکین نے یہ سوچا کہ اب حضرت کو زیادہ تنخواہ دینی چاہیے تاکہ تھوڑی سہولت ہو جائے۔ چنانچہ اراکین نے مشورہ کر کے مجلسِ شوریٰ کی تنخواہ پندرہ روپے کر دی اور اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آپ صدرِ معلم تھے۔ صدر معلم کی تنخواہ سب سے زیادہ ہوتی ہے، باقیوں کی اس سے نیچے ہوتی ہے، جب اوپر سے بڑھے گی تو باقیوں کی بھی بڑھ سکے گی۔ یہ بھی مجبوری تھی۔ چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے بندہ بھیجا کہ جی آج سے آپ کی تنخواہ پندرہ روپے کی جاتی ہے۔ حضرت گھر سے دارالعلوم آئے اور دارالعلوم میں مجلسِ شوریٰ کے اراکین سے فرمانے لگے کہ آپ لوگوں نے میری تنخواہ کیوں بڑھائی؟ انہوں نے کہا کہ جی اب آپ کی عمر زیادہ ہو گئی سہولت ملنی چاہیے۔ فرمانے لگے: نہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ میری تنخواہ آپ لوگوں کو کم کرنی چاہیے۔ انہوں نے پوچھا: کم کیسے؟ فرمانے لگے: جوانی میں زیادہ مشقت اٹھا کے پڑھا سکتا تھا لیکن اس وقت تو تنخواہ دس روپے تھی، اب میں وہ مشقت نہیں اٹھا سکتا، اب میری تنخواہ کم ہونی چاہیے۔ یا اللہ! یہ راز تھا ان حضرات کی اللہ کے ہاں قبولیت کرانے کا۔ دیکھنے میں انسان تھے فرشتوں کی صفات اپنے اندر رکھا کرتے تھے۔

اللہ والوں کی آمدن میں برکت:

حضرت قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تنخواہ مہینے میں دس روپے تھی اب ہو سکتا ہے کہ سوچنے والا یہ کہے کہ جی یہ دس روپے کیا لگائی ہوئی ہے۔ یاد رکھیں تنخواہ کی مقدار تھوڑی ہوتی تھی، تنخواہ میں برکت بہت ہوتی تھی۔ آج تنخواہ کی مقدار بہت

ہوتی ہے، تنخواہ کے اندر برکت کوئی نہیں ہوتی۔ خرچے پورے نہیں ہوتے۔

ہمارے ایک دوست تھے پرچیز منیجر تھے ہمارے، کہنے لگے: کہ میری شادی کو آٹھ سال گزر گئے تھے لیکن کوئی اولاد نہیں تھی، بیوی نے کہا کہ کسی بزرگ کے پاس جا کر دعا کرواؤ۔ مجھے لاہور میں ایک بزرگ کا پتہ چلا کہ میں ان کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوا۔ خادم نے بلایا ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مجھے لا کے شربت کا گلاس بھی پلایا، میں بڑا حیران کہ میں واقف بھی نہیں اور یہ اتنے مہمان نواز کہ ہر آنے والے مہمان کو شربت پلا رہے ہیں۔ جب دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک سفید ریش اندر صحن میں مصلے پر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، شاید چاشت پڑھ رہیں ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہیں آ گئے، مجھ سے ملے، بات کی۔ کہنے لگے: میں کسی کام میں مصروف تھا اسی لیے دیر ہو گئی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ مخلص بندہ نظر آتا ہے جو اپنے عمل کو چھپا رہا ہے ورنہ تو کہتا کہ ہم عبادت میں مصروف تھا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں کام میں مصروف تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ میں نے بتایا کہ یہ مسئلہ ہے دعا کر دیں، انہوں نے دعا کر دی۔ اٹھتے ہوئے میں نے ان کو پانچ روپے ہدیہ دیے۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں اس کی تو ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جی آپ کے ہاں ہر آنے والے کو شربت دیا جاتا ہے، خرچے بھی ہیں، مہمان داری بھی ہے، آپ قبول فرما لیجیے۔ تو میری بات سن کر وہ کہنے لگے کہ نہیں، میں نے دینی کتابوں کی ایک دکان بنا رکھی ہے۔ اور کتابیں بکنے سے مجھے ماہانہ پندرہ روپے اس میں سے بچت ہو جاتی ہے اور میرے تو پندرہ روپے ختم ہی نہیں ہوتے۔ کہنے لگے کہ بیس سال اس واقعے کو گزر گئے، آج تک مجھے وہ منظر یاد ہے کہ اللہ کے بندے نے کیسے کہا کہ میرے تو بیس روپے ختم ہی نہیں ہوتے۔ تو جہاں برکت ہوتی ہے ان کے بیس روپے بھی ختم نہیں ہوتے۔ کیوں؟ ڈاکٹر کا خرچہ زیرو، ادھر ادھر کے نقصان زیرو، بچوں کی بیماریوں کا خرچہ زیرو، ماشاء اللہ! اللہ رب العزت ان کے رزق میں برکت ڈالتے ہیں۔

تو آج رزق ہے برکت کی کمی ہے۔ اگر اللہ کریم برکت عطا فرمادے تو جتنا ہمیں مل رہا ہے، ہماری ضروریات کو پورا کرنے میں یہی کافی ہے۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ یہ حضرات دس روپے سے پندرہ روپے کیوں نہیں کرنے دیتے تھے۔ ان کے رزق میں برکت تھی، دس روپوں میں اللہ رب العزت ان کے خرچے پورے کروا دیتے تھے۔

دوسروں کے حقوق میں خیانت:

خیانت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ دوسروں کے حقوق میں خیانت کی جائے۔ آج جدھر بھی دیکھو ہر طرف حقوق کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ جس کو بھی دیکھو ہر بندہ کہہ رہا ہے کہ ہم اپنے حقوق کی خاطر خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔ حقوق مانگنے کی تو باتیں ہو رہی ہیں کوئی اس لیے بھی پریشان ہے کہ جی میں دوسروں کا حق ادا نہیں کر سکا۔ کیوں بھئی! کوئی دیکھا ایسا پریشان کہ جو کہے جی میں تو بڑا پریشان ہوں میں تو دوسروں کا حق ہی نہیں ادا کر سکا۔ ہونا الٹ چاہیے تھا، ہم میں سے ہر بندے کو اس لیے پریشان ہونا چاہیے تھا کہ جی ہم تو کسی کا حق ہی نہیں ادا کر پائے۔ کام ہی الٹ ہو گیا، حقوق لینے کی باتیں ہوتی ہیں حقوق دینے کی طرف سے آج کوتاہی ہو رہی ہے۔

چنانچہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے فرائض کی نگرانی کرے۔ آج میاں بیوی کے حقوق کے بارے میں بیان کریں تو بیوی وہ نکات یاد کرتی ہے جو خاوند کے لیے ہوتے ہیں کہ خاوند کو کیا کرنا چاہیے۔ اور خاوند وہ پوائنٹ یاد کرتا ہے کہ بیوی کو کیا کرنا چاہیے؟ اور جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو بیوی کہتی ہے کہ دیکھا! آپ کو یہ کرنا چاہیے تھا اور خاوند کہتا ہے کہ دیکھو! حضرت نے کہا تھا کہ تمہیں یہ کرنا چاہیے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ یہ ہمارے معاشرے میں اصل بیماری کی جڑ ہے۔

احساسِ ذمہ داری کی کمی:

غیر ذمہ داری، احساسِ ذمہ داری کا نہ ہونا، یہ آج ہمارے معاشرے میں خرابی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ہم امانت کو امانت ہی نہیں سمجھتے، دفتر کا فون ذاتی استعمال میں، دفتر کے سرونٹ ذاتی استعمال میں اور دفتر کا وقت ہم ذاتی کاموں کے استعمال میں لگاتے ہیں۔ امانت کہاں گئی؟ امانت کا تصور کیا رہا؟ تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس کا خیال رکھیں۔ یہ دفتر کا فرنیچر، دفتر کی چیزیں، امانت ہوتی ہیں۔ کوئی کہے کہ جی میری تو سرکاری نوکری ہے۔ تو بھئی آپ تو اور زیادہ Sensitive (حساس) جاب کر رہے ہیں۔ اکیلے بندے سے تو معافی مانگی جا سکتی ہے، اتنے کروڑ عوام سے تو معافی بھی نہیں مانگی جا سکتی۔ اب قیامت کے دن کیا بنے گا؟ ہمارے اکابر کی اس پر نظر ہوتی تھی، چنانچہ وہ سرکاری چیزوں کو بھی غلط استعمال نہیں کرتے تھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط:

سنیں اور دل کے کانوں سے سنیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہیں بیان کے لیے گئے۔ جب واپس آنے لگے تو کسی نے ایک بنڈل گنے کا دے دیا، حضرت یہ لے جائیے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھئی میں نے تو اپنی ٹکٹ کٹوالی ہے گنے کے پیسے تو نہیں دیے اور اب ٹرین چلنے کا وقت ہے کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ اس نے کہا کہ جی کوئی بات نہیں میں کنڈیکٹر گارڈ کو کہہ دوں گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے تو آگے جانا ہے۔ اس نے کہا کہ جی وہ کنڈیکٹر گارڈ اگلے کو کہہ دے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو اور آگے جانا ہے تو کہنے والا بڑا حیران۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ حضرت! آپ نے کہاں جانا ہے؟ فرمایا کہ میں نے تو اللہ کے حضور جانا ہے۔ اب اللہ کے حضور تمہارا کنڈیکٹر گارڈ مجھے بچا لے گا۔ یہ فرق تھا، ایمان کا کہ وہ امانت کو

امانت سمجھتے تھے اور امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے تھے۔

مطفف کون ہیں؟

سنیے قرآن عظیم الشان، اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾

''بربادی ہے ناپ تول میں کمی بیشی کرنے والوں کے لیے''

''مطفف'' کون ہیں؟

﴿اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o﴾

''جو لوگوں سے لینے کے وقت پورا پورا لیتے ہیں اور دیتے وقت کمی کرتے ہیں''

لینے کا وقت آئے تو پورا لینے کی کوشش کریں اور دینے کا وقت آئے تو کم تول کے کم دینے کی کوشش کریں۔ صرف دکان دار مطفف نہیں ہوتا، میاں بیوی کے درمیان بھی ایک میزان ہے۔ میاں کے حقوق بیوی پر اور بیوی کے حقوق میاں پر۔ اگر میاں حقوق ادا نہیں کرتا تو یہ مطفف، اگر بیوی حقوق ادا نہیں کرتی تو یہ ''مطفف''۔ یہ طفیف ہر شئے میں ہوتی ہے۔

چنانچہ مفسرین نے لکھا کہ اَلطَّفِيْفُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان میزان۔ ماں باپ چاہتے ہیں کہ اولاد بڑی اچھی بنے مگر اولاد کو وہ کچھ نہیں دیتے جو اولاد کو دینا چاہیے، تو یہ مطفف۔ اولاد کہتی ہے کہ ماں باپ ہمیں وہ سب کچھ دیں جو ماں باپ کو دینا چاہیے مگر خود اچھے بچے نہیں بنتے، تو یہ مطفف۔ لہٰذا میزان ہر ایک چیز میں ہونا چاہیے۔ میاں بیوی کے درمیان بھی میزان، ماں باپ اولاد کے درمیان بھی میزان، مالک اور مزدور کے درمیان بھی میزان، پڑوسی اور پڑوسی کے درمیان بھی میزان۔

اپنا جائزہ لیں:

اب سوچیے کہ ہم ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ بیوی کہتی ہے کہ خاوند تو بس میری بیعت کر لے۔ یہ اس کی تمنا ہوتی ہے، مطلب کہ میری انگلیوں کے اشارے پہ ناچے لیکن میں خاوند کی وفادار اور خدمت گزار بیوی بن کے رہوں اس طرف کوئی نہیں سوچتی۔ اور کبھی الٹ ہوتا ہے کہ خاوند یہ تو چاہتا ہے کہ میری بیوی بڑی پاک دامنی کی زندگی گزارے اور خود اپنے لیے آزادی ڈھونڈتا ہے۔ تو یوں وہ مطفف بنا یا نہ بنا؟ امانت میں خیانت ہوئی یا نہ ہوئی؟

شریعت نے کہتی ہے:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ)) (البیہقی، رقم:۳۰۹۵۱)

"مجلس میں کی ہوئی بات بھی امانت ہوتی ہے"

آج یہ جھگڑے کیوں ہوتے ہیں؟ اس گھر کی بات اس گھر میں؟ اس گھر کی بات اس میں اور یہی چیز جھگڑے کی بنیاد بنتی ہے۔ شریعت کتنی خوبصورت ہے؟ کتنے خوبصورت اصول بتاتی ہے زندگی گزارنے کے؟ فرمایا کہ تم جس مجلس میں تھے کوئی بات ہوئی دفن کر دو۔ جگہ جگہ ناٹک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ جو ہوتا ہے جگہ جگہ بات بتانا، یہ بیماری ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾

"تباہی ہے عیب جو اور عیب گو کے لیے"

ھمزۃ الگ اور لمزۃ کو الگ بیان کیا۔ عیب جو اور عیب کو بیان کرنے والا۔ آج تو بس کسی کی تھوڑی سی غلطی کا پتہ چلے اسی وقت سب کو پہنچ جاتی ہے۔ کسی نے پوچھا تھا کہ تیزی کے ساتھ کسی کی بات کو نشر کرنے والا کونسا میڈیا ہے؟ ایک نے کہا: ریڈیو، ایک نے کہا: ٹی وی، ایک نے کہا کہ انٹرنیٹ اور جو کامیاب ہوا اس نے کہا:

عورت۔ بس ایک عورت کو بتا دو، جہاں انٹرنیٹ بھی نہیں پہنچتا، وہاں وہ بات بھی پہنچ جائے گی۔ اسی طرح دوسرے بندے کی باتوں میں کھوج کرید کرنا شریعت نے اس کو بھی منع کیا۔

ایک نوجوان کی امانت داری:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا ٹرین کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ وہ چہرے مہرے سے ایسے لگ رہا تھا جیسے انگریزی پڑھا ہوا ہو لیکن وہ عربی پڑھا ہوا تھا۔ ایم اے عربیک کی ہوئی تھی۔ چند علما آ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے آپس میں عربی میں باتیں شروع کر دیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس بیچارے کو عربی کا کیا پتہ؟ تو جیسے ہی انہوں نے عربی میں بات شروع کی وہ فوراً بول اٹھے کہ جی معاف کیجیے گا کہ میں ایم اے عربی ہوں، مجھے عربی کی زبان سمجھ میں آتی ہے، آپ نے اگر بات کرنی ہے تو کہیں ہٹ کر کریں، میں امانت میں خیانت کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ ہم ہوتے تو ہم سن کے مزے لیتے کہ دیکھو! یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے پتہ نہیں جب کہ مجھے ان کی باتوں کا سب پتہ چل رہا ہے۔

شریعت میں خیانت کی مذمت:

شریعت نے خیانت کی بہت مذمت کی، بہت زیادہ مذمت کی۔ یہاں تک فرمایا کہ قیامت کے دن جو خائن ہوگا، اسے اس خیانت کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ اب ذرا دل کے کانوں سے سنیے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس کا مفہوم یہ ہے۔

((اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُكَفِّرُ الذُّنُوْبَ كُلَّهَا اِلَّا الْاَمَانَةَ))

’’اللہ کے راستے میں شہید ہو جانے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں

سوائے امانت کے“

قَالَ یُؤْتٰی بِالْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ

فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بندے کو پیش کیا جائے گا

وَاِنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

وہ اللہ کے راستے میں شہید ہوا ہوگا

صَاحِبُ الْاَمَانَۃِ الَّذِیْ خَانَ فِیْھَا

اور اس نے امانت کے اندر خیانت کی ہوگی۔

فَیُقَالُ لَہٗ اَدِّ اَمَانَتَکَ

اس کو کہا جائے گا: اپنی امانت کو ادا کرو۔

فَیَقُوْلُ اَیْ رَبِّ کَیْفَ قَدْ ذَھَبَتِ الدُّنْیَا

وہ کہے گا: یا اللہ! دنیا کی زندگی تو چلی گئی

قَالَ فَیُقَالُ: اِنْطَلِقُوْا بِہٖ اِلَی الْھَاوِیَۃِ فَیَنْطَلِقُ بِہٖ اِلَی الْھَاوِیَۃِ یُمَثِّلُ لَہٗ اَمَانَتَہٗ کَھَیْئَتِھَا یَوْمَ اَخَذَھَا فِیْ قَعْرِ جَھَنَّمَ

فرمایا: اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا اور امانت جو اس کو دی گئی تھی اس کی ایک شکل بنا کر اس بندے کو جہنم میں دی جائے گی۔

ثُمَّ یُقَالُ لَہٗ فَاَخْرِجْھَا

اس بندے کو پھر کہا جائے گا: امانت کو نکال کر اس کے اہل کو دو!

فَقَالَ فَیَنْزِلُ اِلَیْھَا فَیَحْمِلُھَا عَلٰی عَاتِقِہٖ

وہ نیچے اترے گا جہنم میں اور اس امانت کو لے کر اس کو اپنے سر اور گردن پر اٹھائے گا۔

ھِیَ عَلَیْہِ اَثْقَلُ مِنْ جِبَالِ الدُّنْیَا

یہ امانت اس کے سر پر دنیا کے پہاڑوں سے بھی زیادہ بوجھل ہو جائے گی۔

حَتّٰی اِذَا ظَنَّ فَھُوَ یَھْوِیْ فِیْ اَثْرِھَا اَنَّہٗ خَارِجٌ زَلَّتْ عَنْ مَنْکَبِہٖ

(شعب الایمان، رقم:۵۲۶۶)

حتی کہ جب وہ گمان کرے گا کہ میں اس امانت کو اٹھا کے جہنم سے نکلنے کے قریب آ گیا۔ وہ امانت اس کے سر سے نیچے جہنم کی تہہ میں گر جائے گی اور یہ بھی اس کے پیچھے گر جائے گا، پھر اس کو اٹھا کے لائے گا، پھر امانت گر جائے گی۔ ابدالابد ساری عمر اس کے ساتھ ایسا ہوتا رہے گا، امانت نہیں ادا کر سکے گا۔ اگر شہید بھی امانت نہیں ادا کر سکے گا تو میں آپ کس کھیت کی گاجر مولی ہیں۔

بھئی ہم سوچیں کہ ہم جو امانتوں میں اتنی خیانتیں کرتے پھر رہے ہیں اس پر ہمارا کیا بنے گا؟ اسی لیے ہمارے اکابر کو امانت میں خیانت کی بہت زیادہ فکر ہوتی تھی۔ وہ اس کا بہت زیادہ خیال کرتے تھے کہ کہیں امانت میں خیانت نہ ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا احساسِ ذمہ داری:

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرادِ مصطفیٰ عشرہ مبشرہ میں نبی علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے جن کی جنتی ہونے کی بشارت مل گئی تھی۔ جن کے بارے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ کَانَ مِنْ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ)) (مسند احمد، رقم:۱۶۷۶۴)

''اگر میرے بعد کسی نبی نے آنا ہوتا تو وہ عمر ہوتا''

فرمایا عمر رضی اللہ عنہ جس راستے پر چلتا ہے شیطان اس راستے کو چھوڑ دیتا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دل و دماغ دیا تھا:

((کَانَ رَاْیُہٗ مُوَافِقًا بِالْوَحْيِ وَ الْکِتَابِ))

''جن کی رائے کتاب اور وحی کے مطابق ہوا کرتی تھی''

ایسی جلیل القدر ہستی اپنے فرض منصبی کے پورا ہونے کے بارے میں ڈرا کرتے تھے، گھبرایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے۔ اگر فرات کے کنارے پر کوئی کتا پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن اس کا حساب بھی عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے ہوگا، میری ذمہ داری ہے۔ اتنا احساسِ ذمہ داری تھا!

بہت توجہ کے ساتھ بات سنیے! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد واپس آئے۔ مدینہ طیبہ میں جب پہلی رات تھی تو سوچنے لگے کہ میں ذرا باہر نکل کر دیکھوں کہ لوگ کس حال میں ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت پر نکل گئے۔ اکیلے، کوئی غلام نہیں تھا، کوئی رفیقِ سفر نہیں تھا۔ ایک خیمہ لگا دیکھا، بڑھیا خیمے کے دروازے پر بیٹھی ہے، سلام کیا، سلام کر کے پوچھا: اماں کس حال میں ہو؟ اس نے کہا کہ ٹھیک ہوں۔ بڑھیا نے پوچھا: ارے میاں عمر کا کیا بنا؟ جواب دیا کہ وہ خیریت سے واپس لوٹ آئے۔ بڑھیا نے کہا: میری طرف سے اللہ تعالیٰ اسے کوئی خیر کا بدلہ نہ دے۔ تو عمر رضی اللہ عنہ گھبرا گئے، پوچھا: اماں کیا ہوا؟ کہا: جب سے وہ خلیفہ بنا ہے مجھے بیت المال سے کوئی درہم و دینار نہیں ملا، وہ خیال ہی نہیں کرتا۔ اماں عمر کو کیا پتہ کہ تم کس حال میں ہو؟ کہنے لگی!! اچھا! امیر المؤمنین بن گیا ہے اور اسے پتہ ہی نہیں کہ میری رعایا کے کسی بندے کے ساتھ کیا گزر رہی ہے؟ جب اس نے یہ کہا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو کہا:

وَا عُمَرَاهُ كُلُّ وَاحِدٍ أَفْقَهُ مِنْكَ يَا عُمَرُ

ہائے عمر! ہر بندہ تجھ سے زیادہ سمجھدار ہے

بڑھیا نے کیسی بات کی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ امیر المؤمنین بنے اور پھر یہ کہے کہ مجھے پتہ ہی نہیں تھا؟ پتہ ہونا چاہیے تھا۔ اب عمر رضی اللہ عنہ وہیں بیٹھ گئے اور بڑھیا سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگے کہ بڑی اماں مجھے تو عمر پر بڑا ترس آرہا

ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں اور آپ اس کے ساتھ اتنی زیادہ خفا اور حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ کہنے لگی کہ میں تو حق کا مطالبہ کیے بغیر نہیں رہوں گی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے منتیں شروع کر دیں۔ اچھا آج تک آپ کو جو تکلیف پہنچی، وہ مظلومیت اگر میں عمر کی طرف سے خریدنا چاہوں تو مجھے آپ بیچ سکتی ہیں۔ وہ بڑھیا کہنے لگی کہ کبھی مظلومیت بھی کسی نے خریدی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ خریدیں یا نہ خریدیں، اپنی الگ بات۔ تو بتا کہ تو اپنی مظلومیت مجھے بیچ سکتی ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ منت سماجت کر لی اور منت سماجت کر لی، کتابوں میں لکھا ہے کہ اتنی عاجزی سے منت سماجت کی کہ وہ بڑھیا تیار ہو گئی۔ اچھا میں وہ مظلومیت بیچتی ہوں۔ کتنے میں بیچتی ہو؟ پچیس دینار کے بدلے میں۔ پچیس دینار اگر تجھے مل جائیں تو تم میرے ہاتھ اپنی مظلومیت بیچ دو گی جو تم عمر کے مقابلے میں حق رکھتی ہو۔ اس نے کہا: ہاں۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ اب اس بات کا فیصلہ کرنے لگے۔ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ امیر المؤمنین کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں جا پہنچے۔ انہوں نے دور سے دیکھا، انہوں نے کہا: السلام علیکم یا امیر المؤمنین! عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ جب بڑھیا نے امیر المؤمنین کا نام سنا تو گھبرا گئی۔ کہنے لگی:

وَاحَسْرَتَا! "ہائے میری کم بختی"

شَتَمْتُ اَمِیْرَ الْمُوْمِنِیْنَ فِیْ وَجْهِهٖ

"میں نے امیر المؤمنین کو اس کے سامنے گالیاں دیں۔"

میں نے سخت باتیں کیں میرا کیا بنے گا؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہنے لگے کہ نہیں تیری میری ڈیل ہو چکی ہے۔ اب تم اپنی بات پر پکی رہنا کہ پچیس دینار میں تو مجھے اپنی مظلومیت بیچ چکی ہے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس قلم تھی، فوراً قلم نکالی، ادھر کاغذ ڈھونڈا نہیں ملا، ادھر ادھر دیکھا نہیں ملا، کتابوں میں لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کرتے کے ایک کونے کو پھاڑ لیا۔ کپڑے کو پھاڑا اور کپڑے کے اوپر ایک

عبارت لکھی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ هٰذَا مَا اشْتَرٰی عُمَرُ مِنْ فُلَانَۃٍ ظَلَامَتِهَا مُنْذُ وَلِیَ الْخِلَافَۃَ اِلٰی یَوْمِ كَذَا وَ كَذَا بِخَمْسَۃٍ وَّ عِشْرِیْنَ دِیْنَارًا

''یہ کہ عمر نے خرید لیا اس عورت کی مظلومیت کو۔ جب سے عمر امیر المومنین بنا فلاں دن سے فلاں دن تک پچیس دینار کے بدلے میں''

فَمَا تَدَّعِی عِنْدَ وُقُوْفِهٖ عِنْدَ مَحْشَرٍ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ تَعَالٰی

''یہ بڑھیا قیامت کے دن اللہ کے سامنے جب کھڑی ہوگی عمر کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کر سکے گی۔''

فَعُمَرُ مِنْهُ بَرِیٌّ وَ شَهِدَ عَلٰی ذٰلِكَ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ

''عمر اس سے بری ہے اور اس پر علی بن طالب اور عبداللہ بن مسعود گواہ بن رہے ہیں۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے عبارت لکھ لی گواہ بنا لیے، گھر آ گئے، مگر دل کانپ رہا تھا کہ ایک عورت نے کہا کہ میں قیامت کے دن عمر رضی اللہ عنہ سے حق مانگوں گی۔ دل گھبرایا ہوا ہے اپنے بیٹے کو بلایا اور بلا کر فرمایا میرے بیٹے۔

((اِذَا نَا مَتُّ فَاجْعَلْهَا فِیْ كَفَنِیْ اَلْقٰی بِهَا رَبِّیْ)) (اعلام الناس: ۱/۱)

جب میری موت آ جائے، اس کو میری قبر کے اندر رکھ دینا، میں اس کو لے کے اپنے رب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

جن کو اپنی امانت میں خیانت کا احساس ہوتا تھا، وہ اپنے رب کے سامنے اتنا ڈرا کرتے تھے۔

نسبت بھی ایک امانت ہے:

آج ہم اپنی امانتوں کا کیا معاملہ کر لیتے ہیں۔ علم بھی امانت ہے، یہ نسبت بھی

امانت ہے، ہم اس امانت کا کیا حال کرتے ہیں۔ ہمارے حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: قیامت کے دن لوگوں سے ایک سوال ہوگا ان کی ذات کے بارے میں اور جس کو نسبت ملی اس کو دو سوال ہوں گے، بتاؤ! نسبت کی خدمت تم نے کی تھی یا نہیں کی تھی۔ بتاؤ پھر کیا معاملہ بنے گا؟

چنانچہ ایک بزرگ تھے حضرت مفتی حسن رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اشرفیہ کے بانی اور حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ۔ ان کے پاس ملنے والے لوگ آرہے تھے اور جو ملنے والا آرہا تھا وہ اس کو کہہ رہے تھے کہ جی آپ جنتی ہیں، آپ جنتی ہیں۔ جو بھی آرہا تھا بھئی آپ جنتی ہیں، بھئی آپ جنتی ہیں۔ سننے والے سوچ رہے تھے کہ آج تو جنت کی ٹکٹیں تقسیم ہو رہی ہیں۔ جب سب چلے گئے تو اس نے پوچھ لیا کہ حضرت آپ نے تو ہر آنے والے کو جنت کی بشارت دے دی۔ فرمانے لگے: دیکھو! یہ لوگ مجھ سے حسنِ ظن لے کے آئے کہ یہ اللہ کا ولی ہے۔ حسنِ ظن ایسا عمل ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطا فرمائیں گے۔ اسی لیے میں نے ان کو میں نے جنت کی بشارت دی۔ پھر فرمانے لگے رہ گئی اپنی بات، مجھے تو قیامت کے دن لگاموں میں باندھ کر کھڑا کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ تم نے نسبت کا حق ادا کیا یا نہیں کیا۔ اگر ثابت ہوا کہ کر دیا تو بچ جاؤں گا، ورنہ اللہ کے حضور حساب دینا پڑے گا۔ ہمارے اکابر ڈرتے تھے، گھبراتے تھے بوجھ اٹھانے سے۔

تو آج ہر سالک کے اوپر ایک ذمہ داری کہ زندگی میں جو امانتیں ہیں ان کا خیال کرے اور جس کو نسبت کی امانت ملے اس پر دہری ذمہ داری لیکن پھر اللہ کی طرف سے اجر بھی ملے گا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ فَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

قیامت کے دن جن کو بھیجا گیا ہوگا، ان سے بھی پوچھیں گے کہ تم نے دعوت کا

حق ادا کیا یا نہیں کیا اور جن کی طرف بھیجا گیا ان سے بھی پوچھیں گے کہ تم نے سن کر قبول کرنے کا حق ادا کیا یا نہ کیا۔ اللہ رب العزت قیامت کے موقف میں ہمیں عزتوں سے نوازے، قیامت کی ذلت سے ہمیں محفوظ فرمادے، زندگی کو دیکھیں تو خیانت ہی خیانت نظر آتی ہے، میرے مولیٰ! آپ محبوب نے فرمایا:

((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ))

ہمارے ایمان کا قیامت کے دن کیا بنے گا؟ اے اللہ! ہمارے اندر امانت کی صفت پیدا کر دیجیے۔ ہم گھر میں:

......اچھے خاوند بن کر رہیں

......اچھے بیٹے بن کر رہیں

......اچھے بھائی بن کر رہیں

......اچھے شاگرد بن کر رہیں

......اچھے استاد بن کر رہیں

......ملک کے ایک اچھے شہری بن کر رہیں

......ایک اچھے انسان بن کر رہیں۔

جو جو ہمارے فرائض ہیں ہم اچھے طریقے سے ان کو ادا کر لیں۔ میرے مولیٰ اب تک جو ہم سے کوتاہی ہوئی معافی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، بس ہم معافی کے طلب گار ہیں۔ میرے مولیٰ آپ معاف کر دیجیے...... اے اللہ! اگر آپ کی رحمت کی نظر نہ ہوئی تو قیامت کے دن شرمندگی کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ آپ مہربانی فرما دیجیے۔ ہمیں قیامت کی شرمندگی سے بھی بچا لیجیے اور دنیا میں جو وقت باقی ہے، امانت کی حفاظت کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما دیجیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾

(الدھر: ۲۵)

کثرتِ ذکر اور اصلاحِ باطن

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

ترکِ ترک سے مراد اپنے ارادے کو ہی فنا کردے، اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کردے، اس کو فناء الفنا بھی کہتے ہیں اور فنائے ارادہ بھی کہتے ہیں۔

اس کا وہی حال ہے کہ جیسے ایک بندے نے غلام خریدا، اس سے پوچھا کہ بھئی آپ کیا پیو گے؟ جواب دیا: جو آپ پلائیں گے۔ کیا پہنو گے؟ جو آپ پہنائیں گے۔ کیا نام؟ جو آپ پکاریں گے؟ تو اگر ایک غلام اپنے آپ کو آقا کے سامنے اس طرح پیش کرسکتا ہے، تو کیا بندہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش نہیں کرسکتا۔ اس کو کہتے ہیں ترکِ ترک کہ ارادے کو ہی چھوڑ دے۔ اس کو مقامِ تفویض کہتے ہیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

کثرتِ ذکر اور اصلاحِ باطن

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۱-۴۲)
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم
((كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ وَهُوَ ذَاكِرٌ))
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

مومنین کو ذکرِ کثیر کا حکم:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب:۴۱)
''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو''

قرآن مجید کی اس آیتِ مبارکہ میں اللہ رب العزت نے ایمان والوں کو ایک حکم دیا۔ یہ ﴿ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ ایمان والوں کو حکم دیا جا رہا ہے، ایک رولنگ دی جا رہی ہے۔ کس بات کی؟ یہ کہ اللہ رب العزت کو کثرت کے ساتھ یاد کرو! تو ایک تو یاد کرنے کا حکم دیا اور ساتھ کثرت کی شرط بھی لگا دی، اس کو کہتے ہیں ذکرِ کثیر۔ اور ذکرِ کثیر وہ ہوتا ہے جو اکثر وقت ہو۔ اس کی تفسیر، مفسرین نے یوں فرمائی

کہ انسان کی تین حالتیں ہیں یا کھڑا ہوگا، یا بیٹھا ہوگا، یا لیٹا ہوگا، تو جو شخص تینوں حالتوں میں اللہ کو یاد کرے، وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنے والا ہے۔

چنانچہ دوسری جگہ فرمایا کہ میرے عقل مند بندے وہ ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ﴾

(ال عمران:۱۹۱)

''جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرتے ہیں''

تینوں حالتوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمہ وقت اللہ رب العزت کو یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ سیدۃ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَذْکُرُ اللّٰهَ تَعَالٰی فِیْ کُلِّ اَحْیَانِهٖ))

(الطحاوی، رقم:۵۵۴)

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لمحے رسول اللہ رب العزت کو یاد کرتے تھے۔''

ہر لمحے اللہ کو یاد کرتے تھے۔ ایک لمحہ بھی غفلت میں نہیں گذرتا تھا، نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ)) (ابی داود، رقم:۱۷۴)

''میری آنکھیں سو جاتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا''

تو سوتے میں بھی دل جاگتا ہے اور دل اللہ رب العزت کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

سوچیے! یہ کتنی عجیب کیفیت ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی انسان اپنے پروردگار کو نہ بھولے۔ ہمارے اکابر نے فرمایا: ''جو دم غافل سو دم کافر'' کہ جو سانس بھی غفلت میں گزر گیا یوں سمجھو کہ وہ سانس کفر کی حالت میں گزر گیا۔ اتنی دیر بھی اللہ سے غافل نہیں ہونا۔

ذاکر کو اللہ یاد رکھتے ہیں:

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کے ایک سو ایک فائدے بتائے ہیں اور ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲)

''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔''

اب بندے کی یاد میں اور اللہ کی یاد میں فرق ہے۔ بندہ یاد کرے اللہ رب العزت کے احکام کی بجا آوری کے ذریعے سے اور اللہ رب العزت اسے یاد کریں گے، اس پر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھولنے کے ذریعے۔ کسی کو سفارش کرنی ہو تو آدمی فون کر کے کہتا ہے کہ جی میرے بچے کو یاد رکھنا۔ اب اس وقت کہنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ میرے بیٹے کا نام لیتے رہنا، نہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب آپ فیصلہ کرنے بیٹھیں تو میرے بیٹے کے حق میں فیصلہ کرنا۔ اللہ رب العزت کی یاد کے یہ معنی ہیں کہ بندہ اطاعت کے ذریعے سے اپنے اللہ کو یاد کرے۔ اللہ رب العزت اپنی رحمتوں کے ذریعے اپنے بندے کو یاد فرمائیں گے۔ اتنی بڑی نعمت ہے اللہ تعالیٰ کا یاد کرنا۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ سالک کا جی چاہتا ہے کہ میں ایک لمحے بھی اللہ سے غافل نہ رہوں۔

حدیث پاک میں آتا ہے:

((إِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي))

''اگر میرا بندہ اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے، میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں''

((إِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٌ مِنْهُ)) (ابن حبان، رقم:۸۱۲)

''اور وہ اگر مجھے لوگوں کی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر فرشتوں کی محفل میں بندے کو یاد کرتا ہوں''

اب فرشتوں کی محفل میں اللہ رب العزت تذکرہ کریں، کتنا اللہ رب العزت کا احسان ہے۔ یوں سمجھیں کہ ایک خاکروب ہے اور بادشاہ اپنی دربار میں اس کا تذکرہ کرے، خاکروب کو پتہ چل جائے تو وہ تو خوشی سے مر ہی جائے گا کہ میرا تذکرہ بادشاہ نے اپنی محفل میں کیا۔ جو خاکروب کا بادشاہ کے ساتھ تعلق واسطہ ہے، بندہ اللہ رب العزت کے سامنے وہ حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ تو اللہ رب العزت بندے کا تذکرہ کریں، سبحان اللہ کتنی اللہ رب العزت کی یہ عزت افزائی ہے۔

نام کے ذکر کا حکم:

اس لیے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الدھر:۲۵)

''اللہ کے نام کو یاد کرو صبح وشام''

بکرۃ سے مراد فجر سے زوال تک اور اصیلا سے مراد زوال سے لے کر رات تک۔ یعنی سارا دن اپنے رب کو یاد کرو۔ ایک صاحب کہنے لگے: جی آپ کیا ہر وقت اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں، اس عاجز نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہنے لگے کہ کہاں حکم ہے؟ میں نے کہا: قرآن پاک کو آپ غور سے پڑھ لیتے۔ اللہ تعالیٰ مسجدوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾

''یہ وہ گھر ہیں جن کو بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا''

﴿وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ (النور:۳۶)

''اور اس میں ذکر ہوتا ہے اس کے نام کا''

اب کوئی بندہ پوچھے: رب کا نام، تو کیا بتائیں گے قرآن مجید کی آیت ہے۔

﴿ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ ﴾

''اس میں اللہ کے نام کا ذکر ہوتا ہے''

پھر ایک جگہ اور فرمایا:

﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى ﴾ (الاعلیٰ:۱۵)

''اور ذکر کیا اس نے رب کے نام کا''

اور ایک اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴾ (المزمل:۸)

''ذکر کر اپنے رب کے نام کا''

بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ اتنی آیتیں قرآن مجید کی ہمیں بتا رہی ہیں کہ ہمیں اللہ رب العزت کے نام کا تذکرہ کرنا ہے۔

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے:

ویسے بھی جن کو محبت ہوتی ہے ان کو محبوب کا نام لینے میں بھی مزہ آتا ہے۔ تو سالک کو اللہ رب العزت سے محبت ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ رب العزت کا نام لینے میں بھی مزہ ہے۔

ہم رٹیں گے اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

تو محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ محبوب کا نام لینے میں مزہ آتا ہے

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
تیرے ذکر سے تیری فکر سے تیرے نام سے تیرے کام سے

تو سالک ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتا ہے۔

یاد کے دو طریقے:

اب یاد کے دو طریقے ہیں۔ دل میں بھی یاد کرے اور زبان سے بھی تذکرے کرے۔ موٹی سی بات ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے، بندہ اس کا تذکرہ کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے مجھے حکم دیا:

((لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ)) (الترمذی: رقم: ۳۲۹۷)

''تمہاری زبان ہر وقت اللہ رب العزت کی یاد سے تروتازہ رہنی چاہیے''

تو دل میں بھی یاد کرے اور زبان پر بھی اللہ رب العزت کے تذکرے۔

مبتدی کا ذکر:

اب جو مبتدی سالک ہے، اس کے لیے ہر وقت یاد کرنے کا آسان طریقہ، مسنون دعائیں پابندی سے پڑھے۔ اتنی برکت ہے مسنون دعاؤں میں کہ ہر موقعہ محل کی مسنون دعا پڑھنے سے اللہ رب العزت کی طرف خود بخود دھیان رہتا ہے۔ تو مبتدی سب سے پہلے اس پر عمل کرے جتنی مسنون دعائیں ہیں اس کو یاد کرے۔ کھانے کی دعا، پینے کی دعا، سونے کی دعا، جاگ کے اٹھنے کی دعا، مسجد میں داخل ہونے کی دعا، گھر سے باہر نکلنے کی دعا، گھر میں داخل ہونے کی دعا۔ آپ غور کریں گے، آپ کو ہر ہر موقعہ کی دعا کتابوں میں مل جائے گی۔ تو ان دعاؤں کو یاد کر کے پڑھنا اپنے لیے لازم کر لیں۔ کیونکہ یہ دعائیں ذریعہ بن جائیں گی، اللہ رب العزت کی طرف دھیان رہنے کا۔ اور الٹی سیدھی سوچوں سے خواہ مخواہ بندے کی جان چھوٹ جائے گی۔

متوسط کا ذکر:

اور جو متوسط ہے اسے چاہیے کہ وہ تحلیل کے ذریعے سے یاد کرے۔ لا الہ الا اللہ۔ چنانچہ دل میں ذکر ہو اور زبان پر تحلیل ہو۔ چنانچہ جن کے تحلیل کے اسباق ہوتے ہیں، تین ہزار، پانچ ہزار، سات ہزار، دس ہزار، ہزاروں مرتبہ وہ ایک دن میں اللہ کا یہ کلمہ پڑھتے ہیں۔ اب ایک دن میں اگر دس ہزار پڑھ رہا ہے تو دس دن میں ایک لاکھ، دو اڑھائی مہینوں میں ایک کروڑ ہو جائے گا، سوچنے کی بات ہے کہ جس بندے نے اپنی زندگی میں کروڑوں مرتبہ اپنے دل پر اللہ کے کلمے کی ضرب لگائی تو کیا یہ ممکن ہے کہ موت کے وقت اس کو کلمہ بھول جائے گا۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ))

''جس حال میں تم زندگی گزارو اسی حال میں تمہیں موت آئے گی''

اس سے پہلے کہ لوگ ہمیں کلمہ پڑھائیں، ہم دعا کریں کہ اللہ ہمیں اپنے اختیار سے کلمہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

منتہی کا ذکر:

اور جو منتہی ہیں ان کے لیے تو اللہ رب العزت حضوری کا ایسا معاملہ کر دیتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ سے ان کا دھیان نہیں ہٹتا۔ تو دل وزبان دونوں کو شامل کر دینا یہی جامعیت ہے۔

ذکر کی اصل:

اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ذکر کی اصل یہ ہے کہ انسان کسی کو دل میں بسا لے

اور بہانے بہانے سے اپنے محبوب کے تذکرے کرتا رہے۔ اور ایسے ہی ہوتا ہے ماں کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے، جہاں بیٹھے گی بیٹے کی باتیں سنائے گی، ایسے کھاتا ہے، ایسے پیتا ہے، یوں بولا فلاں موقعے پر یہ کیا۔ میاں بیوی ابتدائی دنوں میں اگر بیوی کو اپنے خاوند سے سچی محبت ہے تو جہاں بیٹھے گی اسی کے تذکرے کرے گی۔ تو جس بندے کو اللہ رب العزت سے محبت ہو گی وہ بھی اسی طرح جہاں بیٹھے گا اللہ رب العزت کا تذکرہ کرے گا۔

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ لیتے ہیں

اطاعت ذکر ہے:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ))

''ہر بندہ جو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے وہ ذاکر ہے''

یعنی جس وقت انسان اللہ کی اطاعت میں وقت گزار رہا ہوتا ہے وہ اللہ کے نزدیک ذاکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔

اب یہاں سے ایک نکتہ ملا کہ انسان اپنے آپ کو معصیت سے بچالے اور اپنے وقت کو اللہ کے امر کے مطابق گزارے تو پورا دن جو اس کا گزر گیا تو یہ اللہ کا ذکر کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ یہ نکتہ سالکین کے لیے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بعض لوگ دین کا کام کرنے والے، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ذکر یہی ہوتا ہے کہ مصلے پہ بیٹھ کے کیا جائے۔ نہیں، جس وقت ہم اللہ رب العزت کے حکم کے تحت وقت گزار رہے ہوتے ہیں ہمارا وہ وقت اللہ کے ہاں ذاکرین میں لکھا جارہا ہوتا ہے۔ اب کوئی کہے گا جی کسی سے بات کر رہے ہیں تو اس کے وقت ذکر کیسے؟ بھئی بات کرتے ہوئے مخلوق کے حق

کو اگر ادا کرنے کی نیت ہے تو ادائے حقِ خلق میں مشغول ہونا یہ بھی اطاعت ہے، لہٰذا بندہ ذاکرین میں شامل۔

اب وہ عالم جو مدرسہ میں بیٹھ کے میزان الصرف پڑھا رہے ہیں، وہ یہ نہ سوچیں کہ جی ہم تو ہر وقت صرف ہی پڑھاتے ہیں، ہم تو ذکر نہیں کر سکتے۔ نہیں، اگر آپ کی نیت علم کی خدمت کی ہے، دین کی خدمت کی ہے اور اس کی بنیاد باندھنے کے لیے آپ یہ فن پڑھا رہے ہیں تو آپ اللہ کی اطاعت والے کام میں لگے ہیں۔ لہٰذا جتنی دیر پڑھائیں گے، اللہ رب العزت کے ہاں ذاکر لکھے جائیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کا دھیان کبھی ذکر کی طرف رہتا ہے، کبھی نہیں رہتا۔

تو دیکھیں بھائی آج کل سیل فون عام ہے، کبھی اس کی سکرین کی لائٹ On ہوتی ہے، کبھی سکرین کی لائٹ Off (بند) ہوتی ہے، مگر ٹیلی فون تو کام کر رہا ہوتا ہے، سکرین کی لائٹ آن ہونے یا آف ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسی طرح انسان جب اللہ کے حکم کی اطاعت میں لگا ہوا ہے، استحضار رہے تو نورٌ علیٰ نور نہ بھی استحضار رہے تو انسان اللہ کی یاد میں لگا ہوا ہے۔

وقوفِ قلبی کی حقیقت:

ہمارے بزرگوں نے اس کا ایک نام لے دیا کہ ''یہ وقوفِ قلبی'' ہے۔ اب بعض نوجوان سمجھتے ہیں کہ وقوفِ قلبی ہر وقت اللہ اللہ کہنا ہے۔ نہیں اللہ اللہ کہنے کا نام وقوفِ قلبی نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان رکھنے کا نام وقوفِ قلبی ہے۔ جب انسان اللہ کی بات مان رہا ہے، نبی علیہ السلام کے طریقے کے مطابق وقت گزار رہا ہے تو یقیناً اس کا اللہ رب العزت کی طرف دھیان ہے۔

طلبا عام طور پر امتحان سے کچھ عرصہ پہلے خاصے مصروف ہو جاتے ہیں تو چٹیں لکھ

کر پوچھتے ہیں کہ جی ہم تو ذکر کر ہی نہیں سکتے، بھئی آپ جو علم پڑھ رہے ہیں، آپ کا اس علم میں مشغول ہونا آپ کو اللہ کے ہاں ذاکرین کی فہرست میں شمار کروا رہا ہے۔ ہاں اس کے ساتھ اگر دھیان بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور۔

کبھی کبھی انسان کا دھیان حال کے تقاضے کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے، یہ انسان کی فطرت ہے۔ جیسے کبھی طبیعت پہ خوف آ جاتا ہے، یہ انسان کی فطرت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں۔ جب دیکھا کہ اژدھا بن گیا جو کہ عصا تھا،

﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴾ (طہٰ:۶۷)

''تو حضرت موسیٰ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا''

جب ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ فرعون تو آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

﴿اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (القصص:۲۱)

''آپ شہر سے چلے جائیے میں آپ کے ساتھ بھلائی کر رہا ہوں''

قرآن مجید گواہی دے رہا ہے:

﴿فَخَرَجَ خَائِفًا یَّتَرَقَّبُ﴾ (القصص:۲۱)

''موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکلے، خوف زدہ بھی تھے اور پیچھے مڑ کے بھی دیکھتے تھے''

کہ کوئی آ تو نہیں رہا پکڑنے والا تو یہ منصبِ نبوت کے منافی نہیں ہے، فطری چیز ہے۔ اسی طرح حال کے تقاضے میں مشغول ہو جانا، یہ فطرت ہے انسان کی، مگر وہ تقاضا گناہ کا نہ ہو، وہ تقاضا خیر کا ہونا چاہیے۔ جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

((اُجَهِّزُ جَیْشِیْ وَ اَنَا بِالصَّلٰوةِ))

میں نماز کی حالت میں کبھی کبھی اپنے لشکر کی صفوں کو درست کر رہا ہوتا تھا۔ اب

دیکھیے ! یہ فاروق کی نماز ہے، یہ ایک خلیفہ راشد کی نماز ہے، نبی علیہ السلام نے جن کی اتباع کا حکم دیا اور وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نماز میں اپنے لشکر کی صفوں کو درست کرتا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ جہاد کے موقعہ پر غلبۂ حال کا ہو جانا یہ فطری چیز ہے۔ وقت کے تقاضے کی طرف طبیعت متوجہ ہو جاتی ہے۔ اچھا خطبہ دے رہے ہیں اور خطبہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں يَاسَارِيَةَ الْجَبَل کہاں خطبہ اور کہاں یہ بات؟ تو معلوم یہ ہوا کہ ہر وقت ان کے اوپر جو خلافت کی ذمہ داریاں تھیں ان کی طرف سوچ اتنی رہتی تھی کہ کئی مرتبہ سوچ ادھر چلی جاتی تھی تو اس سے وہ عمل خراب نہیں ہوتا۔ کیونکہ سوچ خیر سے شر کی طرف نہیں گئی خیر سے خیر کی طرف گئی ہے۔ اطاعت سے اطاعت کی طرف ہی ہے۔ بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ انہوں نے ایک وقت میں دو اطاعتوں کو جمع کر لیا۔

تو اس لیے طالب علم اگر پڑھ رہا ہے اور پڑھتے ہوئے زیادہ توجہ ادھر ہی ہے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ نیت اگر اللہ کی یاد کی ہے تو یقیناً جتنی دیر بیٹھ کر وہ پڑھ رہا ہے، اتنی دیر وہ اللہ رب العزت کے ہاں ذکر کرنے والوں میں لکھا جا رہا ہے۔

سلوک کے لیے دو لازمی چیزیں:

تو سلوک کے لیے دو چیزیں لازم ہیں:

......ایک کو کہتے ہیں ''دوامِ طاعة''

کہ اللہ رب العزت کی فرمانبرداری کرنا ہمیشہ

......اور دوسری کو کہتے ہیں ''اجتنابِ معصیت''

معصیت سے پرہیز کرنا، اپنے آپ کو گناہ سے بچانا۔

بس ان دو چیزوں میں انسان جب تک لگا رہے، احکام کو پورا کر دے اور منہیات سے اپنے آپ کو بچالے تو یہ گویا اللہ رب العزت کی یاد میں زندگی گزارنے

والا انسان ہے۔ اللہ رب العزت کی اتنی عظمت دل میں پیدا کرلے کہ کسی قیمت پر بھی اللہ کا حکم نہ توڑے۔ دل میں یہ نیت ہو کہ چاہے مجھے کوئی سولی پر لٹکا دے، دریا میں دھکا دے دے، یا پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دے یا سمندر میں غرق کردے، جو مرضی کرلے میں نے اپنے پروردگار کے حکم کو نہیں توڑنا۔

فرمانبرداری ہو تو ایسی:

بادشاہ محمود غزنوی اپنے ایک غلام ایاز سے بڑی محبت کرتا تھا۔ لوگوں نے محمود غزنوی سے پوچھا کہ آپ اپنے اس غلام سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو کبھی بتادوں گا۔

چنانچہ ایک دن کیا ہوا کہ بادشا ایک قیمتی ہیرا لائے اور ایک ہتھوڑا بھی لائے اور لوگوں کو کہا کہ میں آج تمہاری عقل اور ذہانت کا امتحان لوں گا۔ چنانچہ سب لوگ سیریس ہو گئے۔ اس نے کہا کہ ذرا اس ہیرے کو توڑو! اب جس کو بھی توڑنے کے لیے دیا وہ کہنے لگا کہ بادشاہ سلامت یہ تو بہت قیمتی ہے۔ یہ تو آپ کے تاج میں جڑنے کے قابل ہے، اس کو توڑنے سے نقصان ہو جائے گا۔ بادشاہ خوش ہوا اور اس نے وہ ہیرا واپس لے لیا، دوسرے کو دیا دوسرے نے بھی اسی طرح کی ترتیب بنائی، غرض کہ جس کو دیتا گیا سب بہانہ بنا کر انکار ہی کرتے گئے۔ آخر پر اس نے ایاز کو دیا تو ایاز نے حکم سنتے ہی ہیرے کو فرش پر رکھا اور زور سے جو ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو اس کو چورا چورا کر دیا۔ اب لوگ ہنسنے لگے کہ آج اس کی بے وقوفی کا پتہ چل گیا، بادشاہ نے کہا کہ ایاز تم نے اتنے قیمتی ہیرے کو توڑ دیا، اس نے کہا: باشاہ سلامت میرے سامنے دو صورتیں تھیں کہ یا میں ہیرے کو توڑتا یا آپ کے حکم کو توڑتا تو میری نظر میں آپ کے حکم پر میں ایسے لاکھوں ہیروں کو قربان کرسکتا ہوں۔ یہ ہیرا توڑنا کون سی بات ہے اگر

مخلوق اپنے آقا کے ساتھ اتنی محبت کر سکتی ہے تو بندے کو اپنے پروردگار سے کتنی محبت ہونی چاہیے۔ تو اللہ رب العزت کے حکم کی عظمت دل میں ہو کہ جو بھی ہو جائے مجھے حکمِ خدا کو نہیں توڑنا۔ اس لیے کہ جو حکمِ خدا کو توڑتا ہے حقیقت میں وہ اللہ کے در کو چھوڑتا ہے، بارگاہ سے دور ہو جاتا ہے۔

سوچ کو پاک کرنے کی اہمیت:

چنانچہ انسان اپنے خیالات کو قابو میں لائے اور گناہوں کا خیال ذہن میں جمنے ہی نہ دے۔ انسان کا دماغ چوراہے کی مانند ہے، چوراہے میں سے ہر طرح کی ٹریفک گزرے گی، کاریں بھی گزریں گی، بسیں بھی گزریں گی، گدھا گاڑی بھی گزرے گی، سائیکل والا بھی گزرے گا، ٹریفک ہر طرح کی ہوگی لیکن جو پولیس والا وہاں کھڑا ہوتا ہے، اس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ٹریفک کو رکنے نہیں دیتا۔ دائیں کی ٹریفک کو بائیں بھیج دیا بائیں والوں کو دائیں بھیج دیا۔ ٹریفک کو صحیح کنٹرول کرے اور چلتا رکھے تو اسے بہترین تنخواہ ملتی ہے، پروٹوکول ملتا ہے اور اگر وہ ٹریفک کو کنٹرول نہ کرے بلکہ جام کر بیٹھے تو ہر بندہ اس کو لعن طعن کرتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ مومن کا دماغ ایک چوراہے کی مانند ہے، اس میں ہر طرح کے خیال آئیں گے، رحمٰن کی طرف سے بھی خیال دل میں آئیں گے۔ شیطان کی طرف سے بھی۔

﴿اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ﴾ (الانعام:۱۲۱)

''شیطان بھی اپنے دوستوں کو میسج کرتا رہتا ہے''

دماغ میں شیطان کے میسج آتے ہیں اور کبھی کبھی نفس بھی میسج کرتا ہے۔ تو یہ جو دماغ میں شیطان کے میسج آتے ہیں یہ **Rubbish** (فضول) چیزیں ہیں اور فضول چیزوں پر انسان دھیان ہی نہ دے۔ تو برے خیال کا ذہن میں آنا یہ برا نہیں، اس کا

ذہن میں جمانا اور اس سے لطف اندوز ہونا، شریعت کی نظر میں یہ برا ہے۔ تو بس اس پر انسان محنت کرے کہ میں نے اپنی سوچ کو پاک کرنا ہے۔ زنا سے وہ بچے گا جو ذہنی زنا سے پہلے بچے گا۔ جب تک ذہنی زنا سے نہیں بچے گا تب تک زنا سے نہیں بچ سکے گا۔ آنکھ غلط دیکھے گی، زبان غلط بولے گی، پاؤں غلط جگہ اٹھ کے جائیں گے، اس لیے کہ سوچ جو غلط تھی۔ تو اپنے جسم کو انسان شریعت کے مطابق لانا چاہے تو اپنی سوچ کو اس کے مطابق لائے، مشین میں جیسے پروگرام بھر دیا جاتا ہے، وہ ویسے ہی کام کرتی ہے۔ بعض ایسی مشینیں ہوتی ہیں ورکشاپ میں ان میں پروگرام فیڈ کر دیتے ہیں، جیسا پروگرام فیڈ کر دیں وہ ویسا پرزہ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کے دماغ میں جیسا پرگرام فیڈ کیا جائے گا، اس کے اعضا ویسے ہی اعمال کریں گے۔ ہم اگر اپنی سوچ کو پاک کرلیں تو ہمارے اعضا خود بخود ٹھیک کام کرنے لگ جائیں گے۔

اطاعتِ خداوندی کا انعام:

حجاج بن یوسف کا ایک بھتیجا واسق اپنے علاقے کا گورنر تھا۔ نوجوان تھا، خوبصورت تھا، مگر عیاش تھا۔ اس کو بڑا مان تھا کہ میں حجاج بن یوسف کا بھتیجا ہوں اور گورنر ہوں۔ چنانچہ اس نے اپنے آدمیوں کو کہا ہوا تھا کہ کہیں اگر تمہیں بہت خوبصورت عورت کا پتہ چلے تو تم مجھے اطلاع دو! جہاں اسے پتہ چلتا تو وہ حیلے بہانے سے کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ برائی کا مرتکب ہوتا تھا۔ ایک غریب گھر کی نوجوان لڑکی جسے اللہ نے شکل کی حور پری بنایا ہوا تھا، اس کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے اپنے پیغامات بھیجنے شروع کر دیے۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے اس کی طرف تحفے تحائف بھیجنا شروع کر دیے۔ اب دو فتنے ہوتے ہیں، ایک جمال کا فتنہ، ایک مال کا فتنہ، مرد لوگ جمال کے فتنے میں زیادہ پھنستے ہیں اور عورتیں مال کے فتنے میں زیادہ

پھنستی ہیں۔اس کے پاس دونوں فتنے تھے۔ایک عرصہ تک وہ اسے خفیہ طور پر پیغام پہنچاتا رہا۔وہ آگے سے جواب دیتی کہ اگر تم مجھ سے ملاقات چاہتے ہو تو میرے بھائیوں سے بات کرو اور مجھے اپنے نکاح میں لے لو۔یہ کہتا تھا کہ نہیں، میں ویسے ہی تم سے چھپی آشنائی چاہتا ہوں، وہ انکار کرتی۔اب سوچیے یہ کتنا بڑا مجاہدہ ہے اس بچی کے لیے کہ وقت کا گورنر ہے، خوبصورت ہے، مال کی بہتاط ہے، پانی کی طرح وہ مال بہار رہا ہے مگر یہ بچی اپنی جگہ عزم کا پہاڑ ہے، انکار کر دیا۔

جب اس نے دیکھا کہ اس نے تنگ کرنے کی انتہا کر دی، اس نے اپنی والدہ کو بتایا، اس نے اپنے بیٹوں کو بتا دیا۔ان کو یقین نہ آئے کہ علاقے کا اتنا بڑا حاکم اور گورنر اور یہ پیغام بھیجتا ہے۔اس نے ثبوت کے طور پر بھائیوں کو وہ تحفے تحائف بھی دکھائے، بھائیوں کو پھر بھی ابھی تردد رہا۔ایک دن اس بچی نے کہا کہ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ آج رات وہ ہمارے گھر آئے گا۔کیونکہ بھائیوں نے سفر پر جانا تھا لہٰذا وہ سفر پر جانے کی بجائے وہ قریب کے گھر میں چھپ گئے۔یہ صاحب اپنے پروگرام کے مطابق رات کو آئے اور اس گھر میں داخل ہو گئے۔اتنے میں بھائی بھی آ گئے۔انہوں نے جوش میں آکر، غیرت میں آکر اس کو وہیں پر قتل کر دیا۔صبح ہوئی تو اس لاش کے ٹکڑے کر کے انہوں نے بوری میں ڈالا اور جا کر حجاج کے سامنے پیش کر دیا۔یہ آپ کے بھتیجے وقت کے گورنر صاحب ہیں۔حجاج بن یوسف نے تفتیش کی۔جس سواری پر گیا تھا اس کو کنٹرول کرنے والا جو غلام تھا اس کو بھی بلایا، جو لڑکی نے کہا وہی بھائیوں نے کہا، وہی اس کے نوکر نے کہا، اس کو تصدیق ہو گئی کہ واقعی یہ لوگ اپنی بات میں سچے ہیں۔حجاج بن یوسف کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے کہا کہ میں اس کو دفن کرنے کے لیے نہیں بھیجوں گا، اس کی لاش کے ٹکڑوں کو کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا۔وقت کے گورنر کی لاش کو اس نے کتوں کے آگے ڈلوا دیا اور پھر اس نے کہا کہ آج میں

یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ اس نے مال کے ذریعے تمہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی کہ تم غریب بچی تھی، اس کی جتنی جائیداد ہے میں اس کی جائیداد ساری کی ساری اس لڑکی کے حوالے کرتا ہوں۔

اب دیکھیے اگر یہ لڑکی مال کے اوپر فریفتہ ہو کے عزت گنوا بیٹھتی جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالیتی اور مال وہی ملنا تھا جو نصیب میں آنا تھا۔ اب اگر یہ پکی رہی تو اللہ نے عزت بھی رکھ لی، جو مال نصیب میں آنا تھا وہ مال بھی قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن حلال طریقے سے۔ تو بندہ ذہن میں سوچ لے کہ مجھے اللہ رب العزت کے حکم کو نہیں توڑنا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے کتنا ہی مجاہدہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

ذاکر پر زمین کی خوشی:

چنانچہ جو انسان اللہ رب العزت کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتا ہے، زمین کے ٹکڑے اس بندے سے خوش ہوتے ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ زمین کا ایک ٹکڑا دوسرے سے پوچھتا ہے:

((هَلْ جَازَ عَلَيْكَ ذَاكِرُ اللّٰهِ تَعَالىٰ))

"کیا آج تمہارے اوپر کوئی اللہ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے"

تو جس ٹکڑے سے یہ ذاکر گزر جاتا ہے زمین کے وہ ٹکڑے خوش ہوتے ہیں۔

بن دیکھی ذات کا ذکر کیونکر؟

اب یہاں سالک کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جی ہم نے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں، اس کا ذکر کیسے کریں؟ تو بھئی محبت جب ہوتی ہے تو دیکھنا کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ آپ بتائیں! آپکو دفتر میں کسی نے آ کے خوشخبری دی کہ آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور آپ اس وقت دفتر سے نکل بھی نہیں سکتے کہ چھٹی میں ابھی ایک

گھنٹہ باقی ہے۔ تو اس گھنٹہ میں آپ کی حالت کیا ہوگی۔ بیٹے کو تو آپ نے ابھی دیکھا بھی نہیں لیکن ایک لمحہ بیٹے سے دھیان بھی نہیں ہٹتا۔ تو اگر بن دیکھے بیٹے کی یاد دل پر اتنی غالب آسکتی ہے تو کیا سالک کے دل پر اللہ رب العزت کی یاد ایسے غالب نہیں آسکتی؟

نفس میں رب کی یاد:

اور دیکھیں! یہاں ایک علمی نکتہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ﴾ (الاعراف:۲۰۵)

''اپنے رب کو یاد کر! اپنے نفس میں''

مفسرین نے اس کا ترجمہ لکھا ''ای فی قلبك'' اپنے دل میں اللہ کو یاد کرو! مگر عارفین نے کہا کہ نفس سے مراد تو بندے کی پوری ذات ہے۔ دیکھیں یہ لفظ اللہ نے اپنے لیے بھی استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام:۵۴)

اللہ نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا۔

یہاں نفس سے مراد ذات ہے۔ اگر یہ معنیٰ لیا جائے تو معلوم ہوا کہ حکم فرما رہے ہیں ﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ﴾ تم ذکر کرو رب کا اپنی ذات میں۔ کیا مطلب؟ کہ سر سے لے کر پاؤں تک تمہارے جسم کے انگ انگ سے اللہ کی یاد نکل رہی ہو۔ اور ہمارے سلوک کے اندر لطیفہ قالبیہ کا سبق ایسا ہے جب سالک اس سبق کو کرتا ہے تو اس کا پورا وجود ذکر کر رہا ہوتا ہے۔ اس کو سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ تو جو خوش نصیب محنت کرے اور ان کا لطیفہ سلطان الاذکار جاری ہو جائے تو ان کا پورا وجود اللہ کو یاد کر رہا ہوتا ہے، انگ انگ میں اللہ رب العزت کی یاد سما چکی ہوتی ہے۔

چار چیزوں کا ترک

لیکن اس کے لیے انسان کو چار چیزوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ تصوف کی کتابوں میں یہ بات لکھی ہے مگر بہت سارے سالکین اس کو سمجھ نہیں پاتے کہ کون سی چار چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۱) ترکِ دنیا:

اب ترک دنیا کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا چھوڑ دے، پینا چھوڑ دے، بیوی چھوڑ دے، گھر چھوڑ دے، جنگل میں چلا جائے۔ نہیں نہیں، ترکِ دنیا کا مطلب ہے ترکِ لذاتِ دنیا۔ دنیا کی لذتوں کو اللہ کے لیے چھوڑ دے۔ کئی لوگ ہوتے ہیں نا لذتوں کے پیچھے کہ اس کارنر پر تکے بنتے ہیں، ہم شام کو میاں بیوی وہاں جا کر تکے کھائیں گے۔ اس کارنر پر آئسکریم اچھی ہوتی ہے، ہم میاں بیوی شام کو جا کر آئسکریم کھائیں گے۔ یہ پکا فرنگیوں کا طریقہ ہے۔ بھئی اوّل تو گھر بنا کے کھاؤ۔ کوئی چیز خریدنی بھی ہے تو کیا اچھے طریقے سے گھر میں نہیں کھا سکتے؟ ہوٹلوں میں بیٹھ کے کھانے کھاتے ہیں۔ لذتیں گھر میں بیٹھنے نہیں دیتیں۔ چنانچہ روز شام کا معمول ہوتا ہے کہ میاں بیوی نکل جاتے ہیں ذرا گھومنے کے لیے۔ تو ترکِ دنیا سے کیا مراد؟ ترکِ لذاتِ دنیا۔

ایسی ہر طرح سے لذتوں کو چھوڑے کہ انسان کسی گناہ میں ملوث نہ ہو ورنہ لذتوں کے پیچھے آنکھ بھی لذت چاہے گی، زبان بھی لذت چاہے گی، انسان دنیا میں کتنی لذتیں لے گا۔ اس لیے شریعت نے ضروریات کو پورا کرنے کا حکم دیا کہ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے۔ خواہشات کو پورا کرنے سے روکا کیونکہ خواہشات کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جائز لذتوں کو چھوڑ دے، نہیں ترکِ

لذاتِ دنیا سے مراد جو دائرۂ شریعت کے باہر لذتیں ہیں ان کو انسان ترک کر دے۔ جو دائرہ شریعت کے اندر ہیں ان سے فائدہ اٹھائے اور الحمد للہ پڑھے۔ اب اچھا کھانا پیش ہو تو بھئی ہر بندے کو اچھا کھانا اچھا لگتا ہے۔ اب کیا مطلب کہ کھانا ہی چھوڑ دے؟ نہیں! کھائے مگر جس کا دیا کھائے اسی کے گیت گائے۔ جو بیل اچھا کام کرے اس کو چارا ڈالنا مالک کو برا لگتا ہے؟ مالک تو خوش ہوتا ہے چارا ڈال کے۔ تو ہم بھی جب اللہ کا دیا کھاتے ہیں تو اللہ کے ذکر میں، عبادت میں، دین کے کام میں لگیں، ایک تو ترکِ دنیا سے کیا مراد؟ ترکِ لذاتِ دنیا۔ اور لذات سے کون سی لذات مراد؟ وہ لذات جو دائرۂ شریعت کے باہر ہیں، ان لذات کو چھوڑ دے۔ کتنے حلال مشروبات ہیں، اس مشروبات کو پینا اور الحمد للہ کہنا نیک عمل ہے۔ لیکن شراب کو پینا اور اس کے مزے لینا یہ دائرۂ شریعت کے خلاف ہے۔ تو ترکِ لذاتِ دنیا سے مراد وہ لذتیں جو دائرۂ شریعت کے خلاف ہیں۔

(۲) ترکِ عقبیٰ

اور دوسری بات فرمائی کہ ترکِ عقبیٰ۔ یہ ترکِ عقبیٰ کا لفظ پڑھ کر بندہ پریشان ہو جاتا ہے مگر مشائخ نے فرمایا کہ ترکِ عقبیٰ سے مراد یہ کہ آخرت کی نعمتوں کے پیچھے عبادت نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے عبادت کرے۔ یہ ذہن میں نہ ہو کہ حورِ عین سے نکاح ہوگا، کھانے ہونگے، دانے ہوں گے، محل ہوں گے، ایسا نہیں۔

اس لیے بعض اکابر سے غلبۂ حال میں ایسی باتیں منقول ہیں۔

☆...... جیسے رابعہ بصریہ ایک دفعہ نکلیں کہ جی میں پانی کا لوٹا اور ایک انگارہ لے کے جا رہی ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ انگارے سے جنت کو جلا دوں گی اور پانی سے جہنم کو بجھا دوں گی۔ کیوں بھئی؟ اس لیے کہ لوگ جنت کی طلب میں نیکی کرتے ہیں یا جہنم

کے خوف میں اور میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے اللہ کی عظمت کو سامنے رکھ کر اس کی رضا کے لیے عمل کرنے والے بنیں۔ تو یہ ان کے اوپر غلبۂ حال تھا۔ گو کہ جنت کی نیت کے ساتھ عبادت کرنا شرعاً یہ بھی برا نہیں ہے، جائز ہے، تبھی تو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ دعا مانگو:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ))

لیکن یہ دیکھا ہے کہ اگر نوجوان جہاں جاتے ہیں وہیں حور و قصور کی باتیں چھیڑ دیتے ہیں اور حور و قصور کی باتوں کے ذریعے وہ اپنی شہوت کو پورا کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ان تذکروں میں کیا لگنا بھائی! اللہ کی رضا کے لیے عمل کرنا کیا یہ کافی نہیں ہے؟

☆......اس لیے ایک بزرگ تھے ممشاد دینوری رحمۃ اللہ علیہ، ان کو ان کے آخری وقت میں کسی نے دعا دی کہ اے اللہ! ممشاد کو جنت کی نعمتیں عطا فرما!۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ جنت بیس سال سے میرے سامنے پیش ہو رہی ہے، میں نے کبھی اللہ کی طرف سے دھیان ہٹا کے جنت پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

☆......ابن فارض رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ موت کے قریب ان کو جنت کا منظر دکھایا گیا۔ انہوں نے چہرہ ہی پھیر لیا اور یہ شعر کہا:

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَ كُمْ
مَا قَدْ رَاَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

''اے اللہ! اگر میری ساری زندگی کی عبادتوں کا یہ اجر ہے کہ مجھے جنت میں ایک گھر مل جائے گا، اللہ میں نے پھر کیا کیا؟ پوری زندگی ضائع کر بیٹھا''
مجھے تو تیری رضا چاہیے تھی۔

☆......رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا سے کسی نے کہا کہ جنت کا گھر، فرمانے لگیں الجار ثم الدار

کہ پہلے پڑوسی کی بات کرو اس کے بعد گھر کی بات کرو! کہ اللہ ہمیں جنت میں گھر اپنے پڑوس کا گھر عطا فرمائے۔ تو اللہ والوں کی نظر ہر وقت اللہ کی رضا پر لگی رہتی ہے اس لیے محمد علی جوہر نے کہا: ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

تو نہ دنیا کی طمع، نہ عقبہ کی، بس دل پر جو چیز غالب ہو، وہ اللہ کی رضا ہو۔ ہاں اللہ کی رضا اس میں ہے کہ ہم جنت میں جائیں لہٰذا ہم جنت میں ضرور جانا چاہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خود جو بلایا ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ﴾ (یونس: ۲۵)
''اللہ تعالیٰ تمہیں سلامتی والے گھر کی طرف بلاتا ہے''

(۳) ترکِ مولیٰ:

اور تیسرا ترک، اس کو کہتے ہیں ''ترکِ مولیٰ''۔ اب یہ لفظ بھی عجیب سا ہے۔ اس کا کیا مطلب بھئی؟ اس کا مطلب یہ کہ اللہ رب العزت کو انسان دنیا میں پانا چاہے تو کوئی ایسی کیفیت بندے کی نہیں آتی جس میں وہ کہے کہ اب میں نے پا لیا۔ کیونکہ ہم ہیں چھوٹے اور اللہ کی ذات بہت بلند ہے۔ اس کو امامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں خوب کھولا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کو پانا یہ ہے کہ انسان کی معرفت ایسے مقام تک جا پہنچے جہاں اس کا دل سمجھ لے کہ اللہ تو اتنا بڑا ہے کہ میری سوچ سے بھی بلند ہے، لہٰذا میں تمہیں نہیں پا سکتا۔ اس کو کہتے ہیں: ''حسرتِ نایافت'' اللہ تعالیٰ کو نہ پا سکنے کی حسرت۔ چنانچہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں عجیب بات کہی فرماتے تھے:

((اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ ذَاتٍ اِدْرَاکٌ))

"جب انسان اللہ کے ادراک سے عاجز آجاتا ہے یہی اللہ رب العزت کا ادراک ہے۔"

اللہ کا پانا یہی ہے کہ انسان پر اللہ کی اتنی عظمت کھل جائے کہ انسان اپنے دل میں سوچے کہ واقعی اللہ تیری ذات میری سوچوں سے بھی بلند ہے۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ جو کچھ دیکھا گیا، سنا گیا، یا جانا گیا، سب اللہ کا غیر ہے۔ لا کی تلوار چلا کر ہر چیز کی نفی کر دینی چاہیے۔ ہم اللہ کی ذات کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہیں، وہ اس سے بھی بلند ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

وَهُوَ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰى وَرَاءُ الْوَرَاء ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ

حسرتِ نایافت کی تفصیل:

چنانچہ خطبات امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ ایک بزرگ تھے حسین قصاب رحمۃ اللہ علیہ یہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے شیخ تھے۔ فردیت کی لائن کے بزرگ تھے، ان پر اللہ کی محبت کا غلبہ تھا۔ ان کو اللہ رب العزت کی معرفت ملی تو انہوں نے اس معرفت کے سفر کو ذرا استعارے کی زبان میں خوب بیان کیا۔ کہتے ہیں: ایک پہاڑ میرے سامنے تھا اور میں عشق کے گھوڑے پر سوار تھا، چوٹیاں بھی تھیں، کھایاں بھی تھیں، میں کھائیوں سے بچتا ہوا سرپٹ گھوڑا دوڑا کر اس پہاڑ کی چوٹی پر جا رہا تھا۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ بادل تھے، فلاں تھے، اس سے مراد اسماء اور صفات ہیں کہ ان کی بھی ان کو تجلیات نصیب ہوئیں۔ پھر کہتے ہیں کہ بالآخر میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ وہاں پر میں نے خیمہ دیکھا اور شوقِ محبت میں، جنون میں، میں نے اس خیمے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے کہ میرا محبوب خیمے میں موجود ہے۔ اب

اس خیمے سے مراد اللہ تعالیٰ کی اسماء اور صفات ہیں اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اسما اور صفات کے اندر ذات موجود ہے، تو میں اس کا چکر لگا رہا تھا کہ اب میں اپنے رب کے قریب پہنچ گیا اور خیمہ کھلے گا تو میں اپنے رب کا دیدار کروں گا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ یہ ساری بات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حسین قصاب ہزار سال بھی چکر لگائے تو وہ اپنے محبوب کا دیدار نہیں کر سکے گا، اس لیے کہ محبوب خیمے میں موجود ہی نہیں ہے۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ بندہ جو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے نا کہ یہ اسماء وصفات ہیں اور ان کے اندر ذات ہے یہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ محدود نہیں ہے، وہ بے حد حساب ہے، ہم ایک چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اپنی چھوٹی سے عقل کے مطابق، ہمارا پروردگار اس سے بھی بلند ہے، اس سے بھی بلند ہے، اس سے بھی بلند ہے۔ اس کو کہتے ہیں ''حسرتِ نایافت'' کہ بندے کے دل میں یہ بات آجائے کہ میرے مولیٰ تو اتنا بلند ہے کہ میں تیرے ادراک کو حاصل کرنے سے بھی عاجز ہوں۔ جب بندہ اس نکتہ پر پہنچ گیا گویا اس نے اللہ کی عظمت کا اب ادراک کر لیا۔ یہ وصول کہلاتا ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پھر اس سے بھی انسان بے طمع ہو جائے کہ جی مجھے یہ نظر آیا، وہ نظر آیا، یہ کیفیت، وہ کیفیت۔ انسان ان کیفیتوں سے اونچا ہو جائے۔ عبداللطف نہ بنے عبداللطیف بن جائے اور اللہ کے لیے اللہ کی عبادت کرتا رہے۔ اللہ کی رضا کے لیے، کیفیات کے لیے، عبادتیں نہ کرے۔ کیفیت ہو تو بھی عبادت کرے، نہ ہو تو بھی عبادت کرے۔ جیسے ناک کی سیدھ پہ بندہ کام کر رہا ہوتا ہے، یہ بندہ عبادت کرتا رہے۔ اس کو کہتے ہیں ؎

یابم تو را یا نایابم جستجوئے می کنیم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنیم

''میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اس کی جستجو کرتا رہوں، وہ ملے یا نہ ملے میں

اس کی آرزو میں لگا رہوں''

بس اس کی آرزو میں لگا رہنا یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ تو پوری زندگی ہم نے اس طرح گزارنی ہے۔

ملنے یا نہ ملنے کے مختار آپ ہیں
پر تجھ کو چاہیے تگ و دو لگی رہے

بس یہی ہمارا کام ہے کہ ہم لگے رہیں اللہ کی عبادت میں۔ ساری زندگی ملنا نہ ملنا یہ اللہ کے منشا ہے۔ راستے میں موت آگئی پھر بھی کامیاب ہیں، اللہ نے منزل پر پہنچا دیا پھر بھی کامیاب ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اللہ نے ہمیں اس راستے پر چلا دیا، یہی ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔ اس لیے ایک ہوتا ہے عابد، ایک ہوتا ہے عارف۔ عابد کو عبادت کا چسکا ہوتا ہے اور عارف کو اللہ کی رضا کی تمنا ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی رضا کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔

نہ تو ہجر ہے اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

تو اس کو کہتے ہیں ترکِ مولیٰ یہ ایک Term (اصطلاح) ہی بنا دی۔

(۴) ترکِ ترک:

چوتھی بات مشائخ نے کہی: ترکِ ترک۔ اب پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ترکِ ترک سے مراد اپنے ارادے کو ہی فنا کر دے، اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کر دے، اس کو فناء الفنا بھی کہتے ہیں اور فنائے ارادہ بھی کہتے ہیں۔

اس کا وہی حال ہے کہ جیسے ایک بندے نے غلام خریدا، اس سے پوچھا کہ بھئی آپ کیا پیو گے؟ جواب دیا: جو آپ پلائیں گے۔ کیا پہنو گے؟ جو آپ پہنائیں گے۔

کیا نام؟ جو آپ پکاریں گے؟ تو اگر ایک غلام اپنے آپ کو آقا کے سامنے اس طرح پیش کر سکتا ہے، تو کیا بندہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش نہیں کر سکتا۔ اس کو کہتے ہیں ترکِ ترک کہ ارادے کو ہی چھوڑ دے۔ اس کو مقامِ تفویض کہتے ہیں۔ اپنے معاملات کرنے کی کوشش کرنا، نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینا۔ دعا مانگنا اور قبولیت کے معاملے کو اللہ پر چھوڑنا۔

جس کو یہ فنائے ارادہ نصیب ہو گیا تو کیا وہ غصے میں ہو گا کہ جی ہماری سنتا ہی نہیں، دعا کر کر کے تھک گئے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی رضا والی بات آئی نہیں ہے، اپنی منشا پوری کروانی ہے۔ کئی لوگ تو اپنی مرضی پوری کروانے کی دعائیں کرتے ہیں اور کچھ عرصہ پوری نہیں ہوتی تو نماز میں ہی غفلت شروع کر دیتے ہیں۔ بڑی نمازیں پڑھی ہیں جی ہماری دعا تو قبول ہی نہیں ہوتی۔ دیکھو! اب بات سمجھ میں آئی کہ دعا مانگنا ہمارا کام ہے، اس کو قبول کرنا جلدی یا دیر سے یا اس کے بدلے کوئی مصیبت دور کرنا یا قیامت کے دن اس کا بدلہ دینا، یہ مولیٰ کا اختیار ہے۔ تو بندے کا کام ہے کہ دعا کرے پھر خوش رہے۔ میرا مولیٰ مجھے جس حال میں رکھے میں اپنے اللہ سے راضی ہوں۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الدُّعَاءُ وَ عَلَیْكَ الْاِجَابَةِ))

"اے اللہ! میں نے یہ دعا مانگی ہے مگر اس کی قبولیت تو آپ کے اختیار میں ہے"

اور اگر اللہ کے محبوب ﷺ دعا مانگنے کے بعد اللہ کی رضا پر راضی ہوں تو بھئی ہمیں بھی رہنا چاہیے۔ اور دیکھا یہ گیا ہے کہ عورتیں کئی مرتبہ ایک خاص مقصد لے کر دعا مانگتی ہیں۔ مثلاً: فلاں کا بیٹا ہو جائے، بیٹے کو نوکری مل جائے، فلاں جگہ رشتہ ہو جائے۔ اب اپنے ذہن میں چیزیں تجویز کر لیں، جب ایسا نہیں ہوتا تو اللہ سے

ناراض پھرتی ہیں۔ ان بیچاریوں کو سمجھ نہیں لگتی کہ خاوند اور ہوتا ہے، خدا اور ہے۔ یہ خدا کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ رکھتی ہیں۔ ناراض پھر رہی ہیں او جی میں تو دعا ہی نہیں مانگتی، آج کل۔ اللہ اللہ ہے، اس کی عظمت دل میں بٹھانی چاہیے۔ سب ناز نخرے خاوندوں کے ساتھ ٹھیک ہیں، اللہ کی بارگاہ میں تو انبیا بھی تھراتے تھے، پروردگار ایسا ہے کہ کانپتے تھے۔ جب اللہ رب العزت کی ذات پہ معاملے چھوڑ دیں گے تو جو نصیب میں ہوگا اللہ تعالیٰ عطا فرما دیں گے۔

نصیب مل کر رہتا ہے:

چنانچہ قاضی ابوبکر بن محمد بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بڑے قاضی گزرے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عہدۂ قضا ملنے سے پہلے میں حرم میں تھا، سارا دن عبادت کرتا، طواف کرتا، نوافل پڑھتا، میرے پاس کبھی کھانے کو ہوتا کبھی نہ ہوتا، فاقے پہ فاقے آتے تھے۔ مجھے ایک دن طواف کرتے ہوئے شام کو ریشم کی تھیلی ملی اور اس میں بڑا خوبصورت ہار تھا۔ اتنا قیمتی کہ دل میں خیال آیا کہ اگر میں اس کو بیچوں گا تو میری پوری زندگی کا خرچہ نکل آئے گا۔ کہنے لگے کہ صبح ہوئی تو ایک بوڑھے آدمی نے حرم میں آکر اعلان کیا کہ بھئی! میرا ہار گم ہوا ہے اگر کسی کو ملے تو وہ مجھے دے دے۔ میں پانچ سو دینار انعام بھی دوں گا اور شکریہ بھی ادا کروں گا۔ کہنے لگے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ غیر کا مال ہے امانت میں کیوں خیانت کرتا ہے؟ علم کس لیے پڑھا تو نے؟ میں نے اپنی ضرورت کو چھوڑ دیا اور میں نے اس کو وہ ہار بھی واپس کر دیا اور پانچ سو دینار بھی واپس کر دیے۔ مجھے انعام نہیں چاہیے، میرا فرض تھا کہ تیری امانت واپس کروں۔

﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)

کہنے لگے کہ وہ بوڑھا [illegible] ہوا اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ کچھ عرصے کے

بعد خیال آیا کہ کیوں نہ میں رزق کی تلاش میں نکلوں۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں بصرہ جاتا ہوں۔ راستے میں ایک سمندر تھا اس میں ایک جہاز میں بیٹھ گیا، اللہ کی شان سمندری طوفان آیا اور ہمارا جہاز کسی چیز سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ کوئی کسی تختے پر جان بچا کے لیٹا کوئی کسی پر۔ مجھے اللہ نے ایک بڑے جزیرے میں پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کلمہ گو تو ہیں مگر ان کو علم سکھانے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ تو دل میں خیال آیا کہ میں نے علم پڑھا ہی اس لیے تھا، اگر یہاں عالم کوئی نہیں تو میں یہیں رہوں گا۔ میں نے وہاں رہنا شروع کر دیا، اس جزیرے کے تمام مردوں عورتوں بچوں کو میں نے اللہ کا قرآن پڑھایا، دین سکھایا، دین سکھانے کی وجہ سے سب کے دلوں کے اندر میری محبت بھی پیدا ہو گئی۔ اس دوران دو تین سال گزر گئے، ایک دفعہ دو تین بندے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے کہ جی آپ کو تین سال یہاں آئے ہوئے ہو گئے آپ ہم سب کے محسن بھی ہیں، معلم بھی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ نکاح کر لیں۔ میں نے کہا کہ بھئی میں نکاح کیسے کروں؟ میرے پاس تو اسباب بھی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسباب کی بات نہیں، یہاں پر ایک انتہائی نیک بزرگ تھے، حج کرنے گئے، واپس آئے اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ فوت ہو گئے۔ ان کی ایک بیٹی جو بہت خوبصورت ہے اور نیک بچی ہے، یتیم ہے، ہم اس کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں، ہمیں اس کے لیے آپ سے بہتر رشتہ نظر نہیں آتا۔ کہنے لگے کہ لوگوں کے کہنے پر میں نے شادی کر لی۔ جب میری پہلی مرتبہ بیوی سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ وہ ہار جو مجھے حرم میں ملا تھا، وہ میری بیوی نے گلے میں پہنا ہوا تھا۔ میں اس ہار کو حیرت سے دیکھے جا رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا: میری طرف دیکھتے نہیں، میرے ہار کی طرف کی طرف دیکھتے جا رہے ہو، کیا مسئلہ ہے؟ پھر میں نے اس سے کہا کہ بھئی اس کے ساتھ تو ایک واقعہ وابستہ ہے۔ پھر اسے سارا واقعہ سنایا۔ واقعہ سن کر اس کی آنکھوں میں سے

آنسو آ گئے، میں نے پوچھا: آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کہنے لگی کہ میرے والد جب حج کر کے آئے تھے، چاہتے تھے کہ میرا نکاح کر دیں، مگر کہا کرتے تھے کہ مجھے حرم میں ایک نوجوان ملا تھا جس کے دل میں خوفِ خدا تھا۔ کاش اگر وہ کہیں مل جاتا تو بیٹی میں تیرا نکاح اس کے ساتھ کر دیتا۔ تو میرا والد تو فوت ہو گیا، اللہ نے آپ کے ساتھ میرا نصیب جوڑا تھا، اللہ نے مجھے بھی آپ کی خدمت کے لیے پیش کر دیا، یہ ہار بھی اللہ نے آپ تک پہنچا دیا۔

مقامِ تفویض:

مقامِ تفویض اس کو کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرے اور اللہ پر چھوڑ دے، جو نصیب میں ہوتا ہے اَلنَّصِیْبُ یَصِیْب انسان کا نصیب اسے مل کے رہتا ہے۔ یہ نوجوان بچے کیوں ادھر ادھر تانکتے جھانکتے پھرتے ہیں، مطمئن ہو جائیں، جب وقت ہو گا اور اللہ نے ہمیں یہ نعمت دینی ہو گی اللہ رب العزت ہمیں ازدواجی زندگی والی نعمت عطا فرما دے گا۔ تو اس کو کہتے ہیں: مقامِ تفویض یا ترکِ ارادہ یا فنائے ارادہ یا فناء الفنا۔ اور ہمارے بزرگوں نے اس کا نام ترک ترک رکھ دیا۔ تو یہ چار ترک کرنے سے انسان کو پھر اللہ رب العزت کا وصل ملتا ہے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور مقامِ تفویض:

اب یہ مقام کس کو حاصل تھا۔ اس امت یہ مقام سب سے پہلے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی مَیِّتٍ یَمْشِیْ اِلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اِبْنِ اَبِیْ قُحَافَه))

''جو چاہے زمین کے اوپر چلتی ہوئی لاش کو دیکھے، اس کو چاہیے کہ ابو قحافہ کے

بیٹے ابوبکر کو دیکھے۔"

چلتی ہوئی لاش کا کیا مطلب؟ اپنا ارادہ اللہ کی رضا میں گم کر دے، اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ مالک کی مرضی پر قربان۔ یہ فنایت تھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی، ان کی یہ نسبت تھی۔ یہ جو ہمارا سلسلہ عالیہ نقشبندیہ ہے یہ نبی علیہ السلام سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے راستے سے آگے چلا، جو یہاں تک پہنچا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بہت سی نعمتوں سے نوازا لیکن اس کے باوجود عمل میں کمی نہیں ہوتی تھی۔

ایک دفعہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ آج کے دن کس نے روزہ رکھا؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ اٹھایا کہ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میں روزے سے ہوں۔

فرمایا: آج کے دن کس نے کسی کا جنازہ پڑھا؟ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے جنازہ پڑھا ہے۔

آج کے دن کس نے محتاج کو کھانا کھلایا؟ اے اللہ کے نبی! میں نے محتاج کو کھانا کھلایا۔

آج کے دن کس نے بیمار کی عیادت کی؟ اے اللہ کے نبی! میں نے بیمار کی عیادت کی۔

فرمایا جس نے ایک دن میں یہ چار کام کیے میں اس بندے کو جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ اتنا قرب اتنی معرفت مگر اعمال سے پیچھے نہیں ہٹے کہ جی اب تو جنت کا ٹھیکہ مل گیا۔ اعمال میں تو سب سے آگے۔ ہمیں بھی یہی کرنا ہے کہ اللہ رب العزت کی رضا حاصل کرنی ہے، ہر وقت اعمال میں لگے رہیں، صبح شام دن رات اللہ کی عبادت میں لگے رہیں، اپنے آپ کو تھکا دیں، اپنی جوانی کو عبادت میں کھپا دیں۔ سالک کو ایسا ہونا چاہیے۔

چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وہ مقام پایا کہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں

ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سینے کا بال ہوتا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو فتنہ ارتداد اٹھا تھا اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو شاید دنیا میں اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پانچ خصوصیات:

چنانچہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ الخلفا میں لکھا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اللہ رب العزت نے پانچ خصوصیتیں دیں۔ جو ان کے سوا کسی کو نہیں ملی۔

......ایک نبی علیہ السلام نے آپ کے سوا صدیق کا لفظ کسی کے لیے نہیں بولا، یہ لقب آپ کو ملا۔

......دوسرا قرآن مجید میں ثانی اثنین کا تمغہ فقط سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ملا

......تیسرا نبی علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کی سعادت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ملی۔

...... چوتھی بات نو ہجری میں جب حج فرض ہوا تو نبی علیہ السلام نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر حج کرنے کے لیے بھیجا۔

......اور پانچویں بات فرماتے تھے کہ نبی علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری نماز میں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام بنایا اور ان کے پیچھے اقتدا کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ تو یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خصوصیتیں ہے۔

دو مزید خصوصیات:

طالبعلم ہونے کے ناطے دو خصوصیتیں اور بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک خصوصیت تو یہ کہ سارے صحابہ میں سے صرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی چار نسلیں صحابی بنیں۔ ان کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ صحابی، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خود بھی صحابی، ان کے بیٹے عبد الرحمن رضی اللہ عنہ بھی صحابی اور ان کے بیٹے عتیق رضی اللہ عنہ بھی صحابی، چار نسلوں کو صحابیت کا شرف نصیب ہوا۔

اور ایک اور خوبی یہ کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((مَا صَبَّ اللّٰهُ فِيْ صَدْرِيْ اِلَّا وَ قَدْ صَبَبْتُهٗ فِيْ صَدْرِ اَبِيْ بَكْرٍ))

''اللہ نے جو کچھ میرے سینے میں ڈالا میں نے وہ ابوبکر کے سینے میں ڈال دیا''

یہ جو نسبت ہے سینۂ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وہ نعمت ہے جو آج امت کے اندر چلتی چلی آرہی ہے، کیسی پکی نسبت ہے۔

سالک کے رک جانے کی وجوہات

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سارے لوگ بیعت ہو جاتے ہیں لیکن ان کے بڑھنے کی رفتار آہستہ ہوتی ہے یا وہ ایک جگہ پر رکے رہتے ہیں، اس کی کیا وجوہات ہیں؟ یا تو ان کی رفتار تھوڑی ہوتی ہے، گاڑی چل تو رہی ہے مگر ۱۵۔۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے۔ یا ایک ہی جگہ پر رکی کھڑی ہے۔

(۱) وحدتِ مطلب میں کوتاہی:

پہلی وجہ وحدت مطلب میں کوتاہی کرتے ہیں۔ وحدتِ مطلب یہ ہے کہ مطلب ایک ہونا چاہیے اور وہی مقدم ہونا چاہیے۔ جب کہ سالکین ذکر کے لیے بیعت تو ہو جاتے ہیں مگر اِدھر اُدھر کے کاموں میں زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ چنانچہ جب پوچھو کہ معمولات کرتے ہیں؟ تو بتاتے ہیں کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب مریض سے پوچھیں کہ دوائی کھائی ہے؟ اور وہ کہے کہ جی دوا کھانے کی فرصت ہی نہیں ہے، اس کا علاج کیا ہوگا؟ یہی حال ان سالکین کا ہے کہ بیعت تو ہو گئے لیکن معمولات ہی نہیں کرتے اور جو کرتے بھی ہیں، ان سے پوچھو کہ بھئی کتنا مراقبہ کرتے ہیں؟ کوئی کہتا ہے پانچ منٹ کرتے ہیں، کوئی کہتا دس منٹ کرتے ہیں، کیا مزے کی بات ہے؟

مجنوں سے کوئی پوچھے کہ آپ لیلیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آگے سے جواب دے کہ پورے دن میں دس منٹ یاد کرتا ہوں تو اسے مجنون کون کہے گا؟ تو یہ پانچ منٹ مراقبہ کرتے ہیں، دس منٹ مراقبہ کرتے ہیں اور بس۔ حالانکہ جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ مراقبے کے سوا کوئی دن گزرتا ہی نہیں ہے، مراقبہ نہ کریں تو پھر اور کیا کریں؟ ہمارے پلے اس کے سوا اور ہے کیا؟

میری زیست کا حال کیا پوچھتے ہو؟
بڑھاپا نہ بچپن نہ میری جوانی
جو چند ساعتیں یادِ دلبر میں گزریں
وہی ساعتیں ہیں میری زندگانی

تو جو چند ساعتیں اللہ کی یاد میں گزر گئیں، وہ زندگی ہیں اور اس کے بغیر تو باقی ساری کی ساری شرمندگی ہے۔

(۲) شیخ کی ڈانٹ برداشت نہ ہونا:

دوسری بات شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ میں جلدی خفا ہو جانا یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔ حضرت فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک صاحب آئے، حضرت نے تھوڑی دیر مجلس میں بٹھایا پھر فرمایا کہ جاؤ! کہتا ہے جی میں کیسے جاؤں؟ میں تو آیا ہوں آپ کے پاس رہنے کے لیے۔ حضرت نے اس کا سامان اٹھوا کر خانقاہ سے باہر رکھ دیا، وہ گیا اور سامان اٹھا کے پھر لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت نے پھر ڈانٹا کہ جاؤ یہاں سے، جاتے کیوں نہیں؟ پھر سامان اٹھا کے باہر رکھا، وہ پھر سامان اٹھا کے لے آیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا کہ سامان خانقاہ سے باہر رکھا، وہ تینوں دفعہ لے کر آیا۔ تو پھر حضرت نے کہا کہ تم یہاں سے جاتے کیوں نہیں؟ میری جان کیوں نہیں

چھوڑتے؟ وہ آگے سے کہتا ہے۔ ع

مگس ہرگز نہ خواہد رفت از دوکانِ حلوائی

حضرت حلوائی کی دکان سے مکھی نہیں جاتی۔ ہم آپ کی اس محبت کی دکان سے کیسے جائیں؟ حضرت کو محبت آئی اور فرمایا ہاں تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔

تو شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بندے کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اسے برداشت کرے اور شیخ کے ساتھ جڑا رہے۔

(۳) شرک فی الطریقت:

چنانچہ ایک اس کی وجہ شرک فی الطریقت ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ ایک ہوتا ہے شرک فی العقیدہ، یہ جو شرک فی العقیدہ ہے نا یہ اسلام سے مانع ہے۔ اور شرک فی الطریقت وصول الی اللہ سے مانع ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ بیعت تو کر لی مگر کچھ مان بھی لی اور نہیں بھی مانی۔ اپنے نفس کو دوسرا شیخ بنالیا، یہ شرک فی الطریقت ہوتا ہے۔ جو کہا بھئی کرلو! اپنی سمجھ میں آئے گا تو کریں گے۔ کیسے کریں؟ اس کو کہتے ہیں کہ کامل سپردگی نہیں دیتے، جب کامل سپردگی نہیں ہوگی تو پھر اصلاح کا راستہ کیسے طے ہوگا؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے مریض آئے سرجن کے پاس کہ پھوڑا ہے، ڈاکٹر کہے کہ جناب آپریشن کرنا پڑے گا۔ مریض کہے، آپریشن نہیں کر سکتے، آپریشن سے تو درد ہوتا ہے، ویسے ہی ٹھیک کر دیں۔ ویسے تو ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سالک کی طرف سے کامل سپردگی ہونی چاہیے اور شیخ کی طرف سے کامل شفقت ہونی چاہیے۔ سپردگی اور شفقت جب اکٹھی ہو جاتی ہیں اللہ رب العزت بندے کو معرفت عطا فرما دیتے ہیں۔

(۴) شیخ سے بدگمانی:

چوتھی بات، چھوٹی چھوٹی بات پر بدگمانی۔ وہ کیسے؟ مثلاً شیخ سے ملنے آئے وہ کسی کام میں مشغول ہیں، متفکر ہیں، سوچ رہے ہیں، یا ذکر میں ہیں۔ او جی حضرت نے مسکرا کے نہیں دیکھا میری طرف، بس میرا تو یہاں رہنے کو دل نہیں کرتا، اب اس بات سے ناراض ہو کر جا رہے ہیں۔ واہ کیا نازنین طبیعت پائی ہے، نفس کی نزاکتیں دیکھیں کہ حضرت نے تو میری طرف مسکرا کے نہیں دیکھا۔ محبوب بنا لیا نا اپنے نفس کو۔ کہاں ہمارے اکابر کا یہ حال کہ تین مرتبہ سامان اٹھا کے پھینکا اور پھر آ رہے ہیں کہ حضرت میں مکھی سے گیا گذرا تو نہیں۔ وہ حلوائی کی دکان سے اڑانے سے نہیں جاتی، میں اس محبت کی حلوائی کی دکان سے کیسے جا سکتا ہوں؟ اہلِ حق پر اعتراض، مسئلے کی تہہ کا پورا پتہ نہیں ہوتا اور اعتراض۔ مثال کے طور پر: کسی کام میں ہم مصروف تھے ایک صاحب تشریف لائے، انہوں نے پیغام پہنچایا کہ حضرت صاحب کو کہہ دو کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔ میں نے ساتھی کو بھیجا کہ ان کو بٹھاؤ اور کھلاؤ پلاؤ۔ پھر ہم نے ان کو نماز کے بعد بلایا کہ بھئی میں دس پندرہ منٹ یہاں ہوں، پھر میں نے کام سے جانا ہے، مسجد کے کام کے لیے۔ کہنے لگا کہ جی دیکھو کہ میں نے پیغام بھی بھجوایا تھا کہ آیا ہوں۔ مہمان کی جو خدمت سے بڑا کوئی کام نہیں؟ اب ہم مسجد کے کام چھوڑ کر بیٹھ جائیں۔ تو ایسی باتوں سے خواہ مخواہ کی بدگمانی، یہ نہ سوچا کہ وہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں اس کام کا تقاضا کیا ہے؟ گمان یہ کہ میں چونکہ آ گیا تھا اس لیے پندرہ منٹ تو تھوڑے ہیں، میرے پاس تو ان کو رات گزارنی چاہیے تھی، میں مہمان ہوں۔

کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا کہ آ کے تھوڑی دیر وقت گزارتے ہیں اور جو خانقاہ میں خدمت کرنے والے، کام کرنے والے ہوتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کی کوئی

بات دیکھی یا کوئی وجہ دیکھی تو بدگمان ہو گئے۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دفعہ کسی نے کہا کہ آپ کی خانقاہ میں فلاں بندہ جو ہے، وہ اتنے عرصے سے رہتا ہے اور اس کا یہ حال ہے۔ حضرت نے کہا کہ ہاں ہم اصلاح کی کوشش تو کر رہے ہیں مگر اتنا بتا دوں کہ نبی علیہ السلام کی صحبت میں منافقین بھی آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ تو اللہ کے نبی تھے، ان کو اللہ نے بصیرت میں کمال عطا کیا ہوا تھا، نگاہِ نبوت عطا کی تھی، پھر بھی منافقین کو ساتھ لگنے سے منع نہیں کیا۔ تو اردگرد کے کسی بندے کو دیکھ کر شیخ سے ہی بدگمان ہو جانا یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ خدا کے بندے! ہوسکتا ہے کہ یہ صحبت میں آنے والا بندہ کامل نہیں بن سکا لیکن اس نے پتہ نہیں کتنے بڑے بڑے گناہ چھوڑ دیئے ہوں۔ یہ اصلاح کا راستہ ہے، اللہ کرے گا، لگا رہے گا، جڑا رہے گا، اللہ اس کی کامل اصلاح بھی فرما دیں گے۔ تو اس لیے اس تصوف کے راستے میں، صبر اور تحمل مزاجی سے انسان بس اپنے کام کے اوپر جما رہے اور ڈٹا رہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں :ـ

طلب گار باید صبور و حمول

کہ نہ شنیدہ ام کیمیا گر ملول

کہ جو طلب گار ہوتا ہے وہ صبور ہوتا ہے۔ مبالغے کا صیغہ بڑا اصبر ہوتا ہے۔ اور حمول بڑی تحمل مزاجی ہوتی ہے، اس میں۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ سونا بنانے والا کو کبھی اپنے بنانے پر رنج آ گیا ہو۔ جس کو رنج آ جائے، وہ سونا تو نہیں بنا سکتا، ہم بھی اپنے دل کو سونا بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی صبر اور تحمل کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔

سلوک کی بنیاد...... تین چیزیں:

لہٰذا تین چیزیں جو ہمارے اس سلوک کی بنیاد ہیں۔

(۱) ذکر (۲) تلاوتِ قرآن اور (۳) نماز

ذکر سے بھی دل کو شفا ملتی ہے، نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((ذِكْرُ اللّٰهِ شِفَاءُ الْقُلُوْبِ)) (کنز العمال، رقم ۱۷۵۱)

''اللہ کا ذکر دلوں کے لیے شفا ہے''

اور قرآن کے لیے بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾

''شفا ہے اس کے لیے جو سینے میں ہے''

اور فرمایا: ﴿هٰذَا هُدًى وَّ شِفَاءٌ﴾

''یہ ہدایت ہے اور شفا ہے''

اسی طرح نماز بھی انسان کی درستگی کا باعث بنتی ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ

''بے شک نماز بچاتی ہے بے حیائی سے اور بری باتوں سے''

تو قرآن بھی سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا اور ذکر بھی سینے کے لیے شفا اور نماز بھی انسان کو برائیوں سے بچا لیتی ہے۔

تو یہ تین چیزیں بنیاد ہیں، لہٰذا سالک کو چاہیے کہ ذکر میں لگا رہے اور جب وقت ملے تلاوت میں لگے اور وقت ملے نماز میں لگے۔ اپنے فارغ وقت کو ان تین کاموں میں لگائے رکھے۔

نمازِ تہجد کی اہمیت:

نماز ذکر و سلوک کے راستے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے کہ یہ حقیقت میں اللہ سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ جو آدمی چاہے کہ مجھے شربتِ دیدار مل جائے اس کو

چاہیے کہ دو رکعت نماز ادا کرے یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کو اللہ رب العزت کی ملاقات نصیب ہوگئی۔

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ)) (بخاری، رقم: ۴۸)

اس لیے عشق کا تقاضا ہے کہ انسان نوافل پڑھنے والا ہو، یہ محبت کا تقاضا ہے، حدیث پاک میں آتا ہے جو انسان رات کو تہجد پڑھتا ہے تو فرشتے ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔

((قَدْ اِصْطَلَحَ لَيْلَةً مَعَ مَوْلَاهُ))

"اس بندے نے یہ رات اپنے مولا کے ساتھ گزاری ہے"

اور دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی تہجد پڑھتا ہے، اس کے جسم کے اعضا ایک دوسرے کو کہتے ہیں:

((قَدْ قَامَ صَاحِبُنَا لِخِدْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى))

"ہمارا یہ صاحب آج رات اللہ کے سامنے کھڑا رہا"

تیسری روایت ابنِ جوزی نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بندہ تہجد کی نماز پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس بندے کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: بندے! میری عزت کی قسم! رات کو اٹھ کر تو نے جو میری عبادت کی، تیری اس عبادت کی وجہ سے ایک دن آئے گا کہ میں اپنے چہرے کا پردہ اپنے سے ہٹا کر تجھے اپنے چہرے کا دیدار عطا کروں گا۔ اس لیے ہمارے مشائخ نے فرمایا کہ احتیاط یہی ہے کہ عشا کی نماز کے بعد تہجد کے نوافل پڑھ لینا چاہیے۔ آج کل وہ ہمتیں نہیں ہیں، ہر بندہ اٹھ کر پڑھے گا نہیں، بس عشا کے بعد سونے سے پہلے یا عشا کے بعد ہی آپ چار نفل پڑھنے کی عادت بنالیں۔ اٹھ گئے تو نورٌ علیٰ نور ورنہ کم از کم عشا کے بعد، وتر کے بعد کی عبادت میں نام تو ہمارا بھی لکھا

جائے گا۔ تو یہ تہجد کی چار رکعت، آٹھ رکعت یا بارہ رکعت، اس کو پکا کر لے۔ انسان پڑھ کر سوئے اور کئی لوگ تو اس لیے وتر چھوڑ دیتے ہیں کہ اٹھ کے پڑھیں گے اور پھر وتر بھی گئے اور تہجد کی نماز بھی گئی، اس لیے پڑھ لینا زیادہ ضروری ہے۔

اللہ کے ہاں ہمارا کیا مقام ہے؟

ایک بڑی مزے کی بات، سونے کی سیاہی سے لکھنے والی بات ہے۔ اگر کوئی بندہ چاہے کہ میں معلوم کروں کہ اللہ کے ہاں میرا کیا مقام ہے؟ اس کا مختلف بزرگوں نے مختلف جواب دیا ہے۔ جیسے بعض نے کہا کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا رتبہ معلوم کرنا چاہو تو دیکھو کہ اللہ نے تمہیں کس کام میں لگا رکھا ہے۔ اگر تم عبادت میں لگے ہو، نیکی میں لگے ہو، دین کے کام میں لگے ہو، اس کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارا مرتبہ اچھا ہے۔

لیکن نبی علیہ السلام نے بتایا، جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُحِبُّ اَنْ يَّعْلَمَ مَنْزِلَتَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى فَلْيَنْظُرْ كَيْفَ مَنْزِلَةَ اللّٰهِ عِنْدَهٗ)) (مسند ابی یعلی، رقم: ۱۸۶۵)

جو چاہے کہ میں اللہ کے ہاں اپنا درجہ معلوم کرلوں اور وہ یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے دل میں اللہ رب العزت کا کیا مقام ہے؟

تو وہ اپنے دل کو دیکھے۔ اگر دل میں اللہ کی عظمت ہے، اگر دل میں اللہ کی محبت ہے تو یہ سمجھ لے کہ اللہ رب العزت کے ہاں بھی میرا بڑا مقام ہے۔ اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہے اور دل میں بے اطمینانی اور شکوے ہیں تو پھر اللہ کے ہاں بھی مقام اس کے الٹ ہے۔ اس لیے ہم اللہ رب العزت کی محبت کو اپنے دل میں بسائیں۔

بیعت ہونے کا بنیادی مقصد:

بیعت ہونے کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہمارے اندر سے گناہوں کی

نجاست ختم ہو جائے۔ بیعت ہونے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ میں بشر ہوں اور بے شر بن جاؤں۔ بشر سے مراد یہ کہ میں باشر ہوں، میرے اندر شر ہے، بیعت ہو رہا ہوں تا کہ میں بے شر بن جاؤں، میرے اندر سے شر نکل جائے۔ اور یہ شر تو نکلے گا جب ہم ذکر کثرت کے ساتھ کریں گے۔ اور پھر منٹوں کے ذکر سے تو بندوں کے اندر سے شر نہیں نکلتا۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے ہمیں کثرت کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اللہ کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے چلتے پھرتے ہر وقت یاد کریں۔

اپنے وقت کو قیمتی بنائیں:

اب دیکھیے کتنا اللہ کا کرم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے گھر سے فارغ کر کے کچھ وقت کے لیے یہاں پہنچا دیا۔ اب آپ کا یہ وقت ایسے گزرنا چاہیے جیسے نفلی اعتکاف والے کا وقت گزرتا ہے۔ یہاں آ کر ایک دوسرے کے ساتھ سیاست کی گپیں لگانا، ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا، اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ آپ اللہ کی یاد کے لیے آئیں، جتنا بھی وقت ہو آپ اللہ کی یاد میں گزاریں، کیا معلوم کہ یہ تین دن ہماری زندگی کے بدلنے کا سبب بن جائیں۔ تو اپنے وقت کو قیمتی بنائیں، اس کو ضائع ہونے سے بچائیں اور ترتیب کے مطابق وقت گزاریں۔ تین دن اگر آپ نے ترتیب کے مطابق گزار لیے۔ مجھے امید ہے اللہ کی ذات سے، آپ اس کی حلاوت یہاں سے جانے کے بعد مہینوں اپنی زندگی میں محسوس کرتے رہیں گے۔ اجتماعات کے اوپر ہمارے بزرگوں کے فیوضات بہت بکثرت سے ہوتے ہیں تو اس لیے اپنے آپ کو ان تین دنوں میں ہر وقت اللہ کے ذکر میں لگائیں۔ یہی دعا کریں: اے اللہ!

یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لوٹا دوں خانۂ دل آباد رہے
سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے تیرے دل شاد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے
اب تو رہے تا دمِ آخر وردِ زباں اے میرے الٰہ!
لا الٰہ الا اللہ ، لا الٰہ الا اللہ
مجھ کو سراپا ذکر بنا دے ذکر تیرا اے میرے الٰہ!
نکلے میرے ہر بن منہ سے ذکر تیرا اے میرے الٰہ!
اب تو کبھی چھوڑے بھی نہ چھوٹے ذکر تیرا اے میرے الٰہ!
حلق سے نکلے سانس کے بدلے ذکر تیرا اے میرے الٰہ!
اب تو رہے بس تا دمِ آخر وردِ زباں اے میرے الٰہ!
لا الٰہ الا اللہ ، لا الٰہ الا اللہ

اللہ تعالیٰ ہماری حاضری کو قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾

(البقرۃ:۲۲۲)

طہارت کے درجات

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

طہارت حاصل کیے بغیر اللہ رب العزت کے اولیا میں انسان کی شمولیت ممکن نہیں۔ وہ پاک ذات ہے اس کے دوستوں میں شامل ہونے کے لیے بھی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ جیسے گندے لوگوں کو ہم پاس نہیں بیٹھنے دیتے۔ جیسے جس کے منہ سے بو آئے، کپڑوں سے بو آئے، پسینے سے بو آئے کہیں آ کر بیٹھے تو لوگ کہتے ہیں کہ جاؤ میاں صاف ہو کر آؤ۔ ارے ہم انسان ہیں، بندے ہیں، ہمارے پاس اس قسم کی کوئی بدبودار چیز ہو تو ہم ناپسند کرتے ہیں، ناک منہ چڑھاتے ہیں۔ وہ تو پروردگار ہے، وہ تو احکم الحاکمین ہے، وہ بھی پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے پاک ہوں اور اس کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

طہارت کے درجات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان:

اگر سارے انسان ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مانند ہو جائیں اور ساری زندگی عبادت میں گزار دیں تو پھر بھی اللہ رب العزت کی شان میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اور ساری دنیا بت خانہ بن جائیں اور سارے انسان فرعون، نمرود اور شداد جیسے نافرمان بن جائیں تو پھر بھی اللہ رب العزت کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ بلند و بالا ذات ہے۔ انسان اس دنیا میں جو بھی اعمال کرتا ہے وہ اپنی عاقبت اور آخرت سنوارنے کے لیے کرتا ہے۔ انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے اور انہوں نے سمجھایا کہ اے لوگو! اگر تم ایسی شان والی ذات سے تعلق جوڑنا چاہتے ہو تو ہمارے نقشِ قدم پر چلو۔ اگر تم اتنی عظیم ہستی سے نفع اٹھانا چاہتے ہو تو تم ہماری باتوں کی پیروی کرو۔ جیسے ہم زندگی گزار رہے ہیں اگر تم بھی ویسے زندگی گزارو گے تو دنیا میں کامیابی ہوگی اور آخرت میں بھی کامیابی ہوگی۔ اور جن لوگوں نے اس بات کو سمجھ لیا وہ قلیل تھے یا کثیر تھے وہ گورے تھے یا کالے تھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتے تھے یا زمین کی پستیوں

میں رہتے تھے وہ جہاں بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیاب کر دیا۔ نبی ﷺ نے دین امت تک پہنچا دیا۔

تین قسم کے اکابر:

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام علوم کے جامع تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں محدث بھی ہوتے تھے، مفسر بھی ہوتے تھے، فقیہ بھی ہوتے تھے اور شیخ بھی ہوتے تھے۔ اللہ رب العزت نے ان کو سب نعمتیں ایک ہی وقت میں عطا کیں۔ لیکن جب علم کی تفصیلات کھلتی چلی گئیں تو بعد میں آنے والے لوگ دین کے ایک ایک شعبے کو سنبھال کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اس پر محنت کرنی شروع کر دی۔

(۱)...... کسی نے روایتِ حدیث کے منصب کو سنبھالا اور محدث کہلایا۔

(۲)...... کسی نے احادیث کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر مسائل کے ہیرے اور موتی نکالنے کا کام سنبھالا اور ان کو فقہا کہا جانے لگا۔

(۳)...... اور کچھ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے انسان کے باطن کی صفائی کا کام سنبھالا اور یہ وہ لوگ تھے کہ جن کو اپنے وقت کا شیخ کہا جانے لگا۔

فقہا پر تنقید:

ابتدا میں جب اس علم کی تدوین ہو رہی تھی تو چونکہ یہ علم نیا نیا سامنے آ رہا تھا، ناسمجھی میں لوگوں نے اس پر اعتراض کیے اس وقت کے کئی لوگوں نے کہا کہ فقہا نے دین میں اپنی رائے کو داخل کیا ہے۔ لیکن جب حقیقت کھلی تو بعد میں محدثین نے خود فقہا کی پیروی کی۔ حتی کہ امام ترمذی اپنی سنن ترمذی میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا:

وَكَذَالِكَ قَالَ الْفُقَهَاءُ وَهُمْ اَعْلَمُ بِمَعَانِي الْاَحَادِيْثِ

"اور فقہا نے ایسا ہی کہا اور وہی احادیث کے معانی کو بہتر سمجھتے ہیں"

تو وقت کے ساتھ یہ بات کھلی ڈھلی سامنے آ گئی کہ محدثین نے الفاظِ حدیث کے منصب کو سنبھالا اور فقہا نے معانی کے منصب کو سنبھالا اور اس کی حفاظت کرنے والے بن گئے۔

صوفیا پر تنقید:

بالکل اسی طرح جیسے فقہا پر ابتدا میں باتیں کہی گئیں، اعتراضات کیے گئے، وہ لوگ جنہوں نے باطن کی صفائی کے کام کو سنبھالا، اور لوگوں کو تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی محنت سکھائی ان پر بھی اعتراضات ہوئے۔ مگر وہ اعتراضات اس لیے تھے کہ لوگ ان کے کلام کی بلندی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ عربی کا مقولہ ہے:

اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا

"لوگ جس چیز کو نہیں سمجھ پاتے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں"

اپنی سوچ کے مطابق انہوں نے بات کو سمجھنا چاہا اس لیے سمجھ نہ سکے۔ کہتے ہیں:

اَلْمَرْءُ يَقِيْسُ عَلٰى نَفْسِهٖ

"بندہ اپنے آپ پر دوسرے کو قیاس کرتا ہے"

کلام ان بزرگوں کا تھا اور توجیح یہ کر رہے تھے۔ یہاں پر غلطی واقع ہوئی اس کو کہتے ہیں:

تَوْجِيْهُ الْقَوْلِ بِمَا لَا يُرَادُ بِهِ الْقَائِلُ

"کہ کسی کی بات کی ایسی تفسیر اور مراد لے لینا کہ کہنے والے کی مراد وہ نہ ہو"

چنانچہ اس وجہ سے ابتدا میں بعض حضرات پر اعتراضات کیے گئے۔ مشہور بات

......امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کو ایک وقت میں جلا دیا گیا۔ جب غلط فہمی دور ہوگئی تو ان کو آبِ زر سے لکھوا دیا گیا۔

......سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے اعلیٰ کتاب قاضی ایاز لکھی۔ ان پر ابتدا میں یہودیت کا الزام لگا دیا گیا اور بعد میں ان کو وقت کا بڑا محدث سمجھا گیا۔

......امام رفاعی کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو ابتدا میں لوگوں نے ملحد اور کافر کا نام دے دیا اور جب ان کی باتیں سمجھ میں آئیں تو ان کو وقت کا بڑا شیخ سمجھ لیا۔

تو یہ کس لیے ہوا کہ ان کے کلام کو سمجھا نہ گیا۔

اشکالات کا جواب:

لیکن اللہ رب العزت نے وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو کھڑا کر دیا جو بڑی بلند شخصیات تھیں۔ جو دین کے مختلف علوم کے حامل اور کامل تھے اور انہوں نے ان حضرات کے احوال کو بھی سامنے پیش کیا اور ان معارف کو بھی کھول کر بیان کیا جس سے غبار دھل گیا اور چھٹ گیا۔ چنانچہ اہل اللہ کے حالاتِ زندگی مختلف کتب کے اندر لکھے گئے۔

ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ جہاں ایک طرف تلبیسِ ابلیس میں بناوٹی صوفیوں کے خلاف لکھتے ہیں۔ وہاں صفوۃ الصفوہ کے نام سے جو کامل مشائخ ہیں ان کے حالات زندگی بھی جمع کر رہے ہیں۔

شمس الدین سہوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں انہوں ''سِیَرُ الْاَعْلَاءِ النُّبَلَا'' ایک کتاب لکھی ہے اور وقت کے جو بڑے مشائخ تھے ان کے حالات کو جمع کیا حالانکہ یہ محدث تھے۔

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی اور اس میں مشائخ کے حالات کو جمع

کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ محدث بھی ہیں مفسر بھی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک کتاب لکھی اس میں بڑے بڑے مشائخ کے حالاتِ زندگی کو جمع کیا۔

دسویں صدی ہجری میں علامہ عبدالوھاب شیرانی رحمۃ اللہ علیہ جو ایک ہی وقت میں محدث بھی تھے اور فقیہ بھی تھے اور وقت کے شیخ اور صوفی بھی تھے۔ انہوں نے دو بڑے عجیب کام کیے، ایک تو انہوں نے کتاب لکھی ''کشف الغمہ'' اور چاروں مذاہب کے لوگوں کے درمیان جو آپس میں کچھ غلط فہمیاں تھیں ان کو صاف کر کے رکھ دیا۔ پھر انہوں نے ''میزانُ الکبری'' کتاب لکھی اور اس پر اور زیادہ بہتر کام کیا۔ اور اس کے بعد ایک کتاب لکھی ''الطبقات الکبری'' اور اس میں ایک ہزار سال میں اس امت میں جتنے بڑے بڑے مشائخ گزرے ہیں ان کے حالاتِ زندگی، ان کے علوم و معارف، ارشادات وہ سب کے سب جمع کر دیئے۔

فقہائے اربعہ اور مشائخِ اربعہ:

چنانچہ جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ چار فقہا کی عظمت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اور ان کو فقہ کا امام مان لیا گیا امت کا اجماع ہے اس کے اوپر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ۔ امت ان کے اوپر جمع ہوگئی۔ اسی طرح مخلصین کے جو سردار تھے ان کو بھی اپنے وقت کا امام کہا گیا اور ان میں چار حضرات وہ تھے کہ جنہوں نے قبولیت پائی، جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ معین الدین چشتی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی بخاری رحمۃ اللہ علیہ، شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ۔ تو جس طرح فقہا کے مسائل پر لوگوں نے عمل کر کے ظاہری احکام شریعت کے مطابق بنائے اسی طرح ان چار مشائخ کے جو بتائے ہوئے علوم و معارف تھے، اس کے مطابق زندگی گزار کر انہوں نے اپنے باطن

کا تزکیہ اور تصفیہ کیا۔ امت کے کروڑوں انسانوں نے ان کی تعلیمات پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو باطن کی روشنی عطا فرمائی۔

علم الاحسان:

یہ راستہ تزکیہ نفس کا راستہ ہے، اس کو علم الاحسان کہتے ہیں۔ جیسے حدیثِ جبرئیل میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے آ کر پوچھا:

((مَاالْاِیْمَانُ)) ایمان کیا ہے؟

((مَاالْاِسْلَامُ)) اسلام کیا ہے؟

((مَاالْاِحْسَانُ)) احسان کیا ہے؟

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان کے بارے میں

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنَّکَ اِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ))

(الترمذی: رقم ۲۵۳۵)

کہ تو اللہ تعالیٰ کی ایسے عبادت کر کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ کیفیت حاصل نہیں تو پھر ایسے عبادت کر کہ اللہ رب العزت تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

اب آج ہماری نماز نہ پہلے درجے کی ہے اور نہ دوسرے درجے کی ہے۔ جان اللہ کو دینی ہے، اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھیے دو درجے بتا دیئے گئے۔ نماز کے بارے میں ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) اللہ کی عبادت ایسے کر کہ جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے۔ تو اگر ہماری نماز میں مشاہدے کی یہ کیفیت تو نہیں ہوتی اور دوسری بتائی گئی ((فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) اگر یہ کیفیت حاصل نہیں تو یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ کیفیت بھی نہیں ہوتی تو پھر ہم کس درجے کی نمازیں پڑھتے پھر رہے ہیں۔ آج ہم کیوں نہیں نماز بنانے کی محنت کرتے؟

عبادت کی حقیقت کو پانے کا نام تصوف ہے:

قربِ قیامت کی علامتیں بتائی گئیں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تو دیکھے گا کہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی ہوگی مگر ان کے دل اللہ کی یاد سے خالی ہوں گے اور آج وہ حالات آچکے ہیں۔ ایک مسجد میں امام صاحب نے نماز پڑھائی اور ان کو نماز کے بعد شک تھا کہ دو رکعت پر سلام پھیرا ہے یا چار پر۔ انہوں نے مقتدیوں سے پوچھا، بھری مسجد میں ایک بندہ بھی نہیں تھا کہ جو یقین سے کہتا کہ ہم نے چار پڑھی ہیں یا دو پڑھی ہیں، سب متذبذب تھے پتہ نہیں کتنی پڑھی ہیں؟ اس درجے کی ہم نمازیں پڑھ رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہمیں ٹھوکر مارے ہوئے لوگوں میں شامل کر دیا جائے کہ تو کھڑا میرے سامنے ہوتا تھا اور تیرے دل میں دنیا بھری ہوتی تھی، تمہیں حاضری حاصل تھی حضوری حاصل نہیں تھی۔

توجہ طلب بات ہے۔ دیکھیے جب آدمی کسی پھل والی دکان پر جاتا ہے اور دکاندار پوچھے کہ کیا آپ کو کیلے چاہئیں؟ اور بندہ ایک نظر ڈال کر دیکھے کہ گلے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے کہ تولنے کی ضرورت ہی نہیں مجھے نہیں چاہئیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ قیامت کے دن ہمارے اعمال بھی ایسے ہوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک نظر ڈال کر کہہ دیں کہ ریا ہے، دنیا بھری ہوئی ہے، تولنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں یہ سودا ہی نہیں چاہیے، لے جاؤ! جو کچھ تمہارے دلوں میں بھرا تھا تم انہی سے جا کر اس کا بدلہ اور اجر مانگ لو۔

تو یہ بہت اہم بات ہے کہ ہم اپنی عبادات کو کس طرح بنائیں اور کس طرح سنواریں۔ اب اگر آج کے دور میں یہ بات کہی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تصوف کہاں سے آگیا؟ جب تک شریعت میں احسان کا نام موجود ہے تب تک مومن کی

زندگی میں تصوف موجود ہے۔ انداز کے بدل جانے سے کیا ہوتا ہے؟ تصوف صفا سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے باطن کی صفائی۔ یہ چونکہ آسان لفظ تھا اس لیے لوگوں نے یہی بولنا شروع کر دیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بنیاد دیکھو موجود ہے یا نہیں۔

طہارت کے تین درجے:

اگر کوئی بندہ چاہے کہ اسے اللہ رب العزت کا تعلق ملے تو ہمارے مشائخ نے لکھا کہ اسے اپنے آپ کو پاک کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ تعلق کی کچھ شرائط ہوتی ہیں۔ جیسے دنیا میں دو مشینیں اکٹھی ہوں تو Compatibility ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ رب العزت کے خاص بندوں میں داخل ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اور سالکین کو سمجھانے کی خاطر ہمارے مشائخ نے اس کو چار مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں باطن کی صفائی، باطن کی پاکیزگی، اپنے آپ کو پاک کرنا، اردو میں کہتے ہیں طہارت۔ طہارت عربی کا لفظ ہے اردو میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سنیے اور دل کے کانوں سے سنیے، حاضر باش ہو کر بیٹھیے۔ طہارت حاصل کیے بغیر اللہ رب العزت کے اولیا میں انسان کی شمولیت ممکن نہیں۔ وہ پاک ذات ہے اس کے دوستوں میں شامل ہونے کے لیے بھی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ جیسے گندے لوگوں کو ہم پاس نہیں بیٹھنے دیتے۔ جیسے جس کے منہ سے بو آئے، کپڑوں سے بو آئے، پسینے سے بو آئے کہیں آ کر بیٹھے تو لوگ کہتے ہیں کہ جاؤ میاں صاف ہو کر آؤ۔ ارے ہم انسان ہیں، بندے ہیں، ہمارے پاس اس قسم کی کوئی بدبودار چیز ہو تو ہم ناپسند کرتے ہیں، ناک منہ چڑھاتے ہیں۔ وہ تو پروردگار ہے، وہ تو احکم الحاکمین ہے، وہ بھی پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے پاک ہوں اور اس کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔ اس لئے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

''بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اب یہ جو پاکیزگی یا طہارت ہے اس کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ

ظاہری طہارت

سب سے پہلا درجہ ہے ظاہر کی پاکیزگی، اس میں کپڑوں کا پاک ہونا، جسم کا پاک ہونا اور مال کا پاک ہونا، یہ تین چیزیں آتی ہیں۔

جسم اور کپڑوں کا پاک ہونا:

آج کل پاکیزگی پر ہی مسلمان توجہ نہیں دے رہے۔ کھڑے ہو کر پیشاب سے فراغت حاصل کر لی، باتھ روم میں گئے پتہ ہی نہیں پانی کیسے استعمال کرنا ہے؟ طہارت کا معاملہ اتنا خراب ہے! اتنا خراب ہے! الامان والحفیظ۔ آپ پتہ کر کے دیکھ لیں اگر پوچھیں نا لوگوں سے کہ بھئی طہارت کے مسائل کسی سے سیکھے ہیں تو مشکل سے کوئی ایک ہوگا جو ہاتھ کھڑا کر کے کہے گا کہ میں نے طہارت کے مسائل استادوں سے سیکھے ہیں اور طہارت کرنی سیکھی ہے۔ آج کون سکھاتا ہے؟ کوئی نہیں سکھاتا۔ اپنی مرضی سے چلتے رہتے ہیں۔ باتھ روم میں وضو کیا، گیلے پاؤں کے ساتھ قالین پر چڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور کئی دفعہ دیکھا کہ باتھ روم میں وضو کیا اور ننگے پاؤں جوتوں کی جگہ سے گزر کر مسجد میں آرہے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرتے ہوئے دو قبر والوں کو دیکھا کہ

ان کو جہنم کا عذاب ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے ایک قبر والے کو پیشاب کے قطروں سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے اور دوسرے آدمی کو چغل خوری کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔ تو اگر ہم ظاہری پاکیزگی اختیار نہیں کریں گے تو پھر ہماری عبادتیں کیسے ہوں گی؟ تو یہ مستقل سیکھنے کی بات ہے۔ اس کے لیے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب آپ سے کوئی پوچھے کہ جہاز میں سفر کرتے ہیں تو چھوٹی سی جگہ ہوتی ہے فراغت کے لیے تو کیسے اپنے کپڑوں کو پاک رکھ کر انسان، طہارت اختیار کر سکتا ہے؟ تو بھئی کبھی سیکھا کسی سے؟ نہیں نہ کبھی پوچھا نہ کسی نے بتایا۔ باتھ روم میں بیٹھنے کے لیے کبھی نیچے کی سیٹ ہوتی ہے کبھی اوپر کی، تو کوئی نہیں بتائے گا کہ کیسے استعمال کرنا ہوتا ہے؟ شیخ نے یہ چیزیں بتانی ہوتی ہیں، باقاعدہ تربیت ہوتی ہے۔ تو بدن کی پاکیزگی کیسے حاصل کی جائے، سنت کے طریقے سے غسل کیسے کیا جائے؟ کسی نے سکھایا ہمیں؟ یہ سیکھنے کی چیزیں ہیں، اس کے بغیر جسم پاک نہیں رہتا۔ تو جسم کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا یہ مستقل سیکھنے کی باتیں ہیں۔

مال پاک ہونا:

اور اس کے بعد مال کا پاک ہونا یہ مال کا معاملہ آج کل سب سے زیادہ ٹیڑھا معاملہ ہے۔ ہر بندہ اس دوڑ میں لگا ہوا ہے کہ مجھے مال زیادہ ملے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ مال میں برکت مانگتے تھے، آج کے زمانے میں مال میں کثرت مانگتے ہیں۔ کھلا رزق مل جائے، تنخواہ بڑھ جائے یہ کیا چیز ہے؟ یہ مال کی کثرت ہے، کثرت مانگتے ہیں۔

عمر لمبی ہو جائے عمر میں کثرت مانگتے ہیں برکت نہیں مانگتے۔ اللہ میری عمر میں برکت دے! عمر میں برکت یہ ہوتی ہے کہ جتنی عمر اللہ نے لکھی آخری لمحے تک اس

کی بینائی، سماعت، صحت، ہر چیز صحیح سلامت رہے۔ یہ غیر کا محتاج نہ ہو اس کو عمر کی برکت کہتے ہیں۔ یہ بھی کیا عمر ہوئی کہ عمر تو نوے سال کی اور چالیس پچاس سال سے بلڈ پریشر کا مریض، چالیس پچاس سال سے ہارٹ کی بیماریاں، نہ کھا سکتا ہے نہ کچھ پی سکتا ہے، کبھی شوگر کا مریض، اب عمر تو ہے لمبی لیکن عمر میں وہ برکت نہیں۔ نہ کام کر سکتا ہے، نہ محنت کر سکتا ہے، بیماروں کی طرح وقت گزارتا پھر رہا ہے۔ تو عمر کی کثرت اور چیز ہے عمر کی برکت اور چیز ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عمر کی برکت مانگا کریں اللہ میری عمر میں برکت عطا فرما۔

مال کی کثرت اور برکت میں فرق:

مال کی کثرت اور چیز ہے مال میں برکت اور چیز ہے۔ جب مال میں اللہ تعالیٰ برکت دے دیتے ہیں تو جتنا انسان کے پاس ہوتا ہے اتنا ہی اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو جاتا ہے، یہ ہے مال میں برکت۔ چنانچہ آپ نے کئی لوگوں کو دیکھا ہوگا، تھوڑی آمدن ہوتی ہے مگر مقروض نہیں ہوتے اور کئی لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ لاکھوں میں کھیلنے والے مگر لاکھوں کے مقروض ہوتے ہیں۔ کہنے کو بڑے بڑے مل آنر ہیں، کارخانے دار ہیں، مگر قرضے بھی ان پر پہاڑوں جیسے۔ تو مال کی کثرت نہ مانگیں بلکہ مال کی برکت مانگیں کہ وہ انسان کی ضروریات کو کافی ہو جائے۔

بلوں سے رزق:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک صحابی قضائے حاجت کے لئے شہر سے ذرا باہر تشریف لے گئے۔ انہوں نے ایک چوہے کو دیکھا وہ اپنے بل میں گھسا۔ بل اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے اور انگلش میں بھی۔ اردو میں سوراخ کو کہتے ہیں جس میں کوئی

جانور یا چوہا جاتا ہے اور اس میں رہتا ہے، اس کو بل کہتے ہیں۔ اور انگلش میں ہو تو وہ جو رقم کی صورت ادا کرنا پڑ جاتا ہے۔ تو وہ صحابی کیا دیکھتے ہیں کہ چوہا آیا اور بل کے اندر گھسا اور اس میں سے اس نے ایک دینار لا کر باہر ڈال دیا۔ پھر گیا، دوسرا دینار لا کر ڈال دیا۔ پھر گیا، تیسرا دینار، حتی کہ اس نے سترہ دینار اندر سے نکالے اور باہر لا کر ڈال دیئے۔ یہ صحابی فارغ ہو کر اٹھے تو وہ سترہ دینار اٹھائے اور نبی ﷺ کی خدمت میں لا کر ڈال دیے کہ اے اللہ کے محبوب ﷺ چوہے نے اس طرح سترہ دینار بل سے نکال کر ڈالے، میں اٹھا کر لایا ہوں۔ کیا میرے لیے جائز ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس طرح پہنچا دیا ہے۔

اب ہماری زندگیوں اور صحابہ کرام کی زندگیوں میں فرق کا اندازہ لگائیں۔ ان کو بلوں سے روزی سے ملا کرتی تھی اور آج ہماری ساری روزی بلوں میں چلی جاتی ہے۔ ہمارے اوپر بل مسلط ہوتے ہیں، ٹیلیفون کا بل، گیس کا بل، انشورنس کا بل، سارا مہینہ بل، جو کماتے ہیں بلوں کی نظر۔ ان کو اللہ تعالیٰ بلوں سے روزی دیتے تھے اور ہم جو سارا مہینہ روزی کماتے ہیں بلوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ آج دلوں پر بلوں نے قبضہ کیا ہوا ہے، کس لیے؟ اس لیے کہ اللہ سے مال کی کثرت مانگتے ہیں، برکت نہیں مانگتے۔ اگر برکت مانگتے تو اللہ تعالیٰ ان کو غیر کا محتاج نہ بناتے۔

رزق کے شکوے:

دیکھیں! جس قدر آج روزی کے شکوے ہیں، پہلے زمانے میں ایسے نہیں تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں لوگوں پر فاقے زیادہ آتے تھے، تنگی زیادہ آتی تھی مگر ان کی زبانوں پر رزق کے شکوے اتنے نہیں تھے جتنے شکوے آج کے زمانے میں ہیں۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ آج اس زمانے میں بھوکا مرنے والوں کی تعداد کم

ہے اور زیادہ کھا کر مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیوں جی؟ یہ جو شریانیں بند ہوتی ہیں، تو یہ شریانیں فاقے سے بند ہوتی ہیں یا کھانے سے بند ہوتی ہیں۔ یہ بلڈ پریشر کھانے سے زیادہ ہوتا ہے یا فاقے سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ شوگر کھانے سے زیادہ ہوتی ہے یا فاقے سے زیادہ ہوتی ہے۔ تو آج وہ امراض جو زیادہ کھانے سے ہوتے ہیں ان سے مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، بھوک سے مرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور شکوے آج سب سے زیادہ یہ کہ رزق نہیں ہے۔ ذراسی کسی بات میں تنگی ہوئی، بجائے اس کے کہ اللہ رب العزت سے مانگیں اور بار بار مانگیں، شکوے شروع۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ جس کا کاروبار نہیں چل رہا وہ بھی شکوے کر رہا ہے، جس کا چل رہا ہے وہ بھی شکوے کر رہا ہے۔ جس کا نہیں چلتا اس سے پوچھیں کہ کیا حال ہے؟ اس کی زبان پر یہ الفاظ کہ ہماری تو سنتا ہی نہیں، بڑی نمازیں پڑھی ہیں، بڑی دعائیں مانگی ہیں، ہماری تو سنتا ہی نہیں اور جس کا بہت اچھا چل رہا ہے اگر اس سے پوچھیں کہ سناؤ بھئی کام کیسا ہے؟ تو بس بھئی گزارہ ہو رہا ہے۔ کیا ہوا؟ کیوں نہیں یہ زبان کھلتی؟ کیوں نہیں اللہ کے بارے میں یہ کہتے کہ میں قربان جاؤں، اس اللہ رب العزت کی ذات پر اس نے میری اوقات سے بہت زیادہ دیا ہے۔ ہم کیوں نہیں یہ کہتے؟ ہمیں چاہیے کہ یہ کہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی کیسے حمد کروں؟ میں تو سجدے میں ساری زندگی سر رکھوں تو بھی میں شکر ادا نہیں کر سکتا کہ مجھے اللہ نے غیر کا محتاج نہیں کیا۔ ہم کیوں نہیں اس کی تعریف کرتے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک ولی کو الہام کیا اور فرمایا کہ میرے پیارے! میرے بندوں سے کہہ دو، اگر تمہیں رزق میں کوئی تنگی محسوس ہوتی ہے تو تم فوراً میرے بندوں کی محفل میں میرے شکوے کرنا شروع کر دیتے ہو جبکہ تمہارے نامہ اعمال گناہوں سے بھرے ہوئے میرے پاس آتے ہیں،

میں کبھی فرشتوں کی محفل میں تمہارے شکوے نہیں کرتا، میں تمہاری شکایتیں نہیں کرتا کہ میرا دیا کھاتے ہیں اور میرے حکموں کی نافرمانی کرتے ہیں۔

ضروریات کی حد اور خواہشات بے حد:

ہر بندہ ایک دوڑ میں لگا ہوا ہے، جتنے بندے گھر کے ہیں اتنے ہی نوکری کرنے والے ہیں، کام کرنے والے ہیں اور ضرورتیں پھر پوری نہیں ہوتیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ ہم نے خواہشات کو اپنی ضرورت بنالیا ہے۔ ضرورت کی ایک حد ہوتی ہے خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ چونکہ خواہشات کی کوئی حد نہیں اس لیے ساری عمر بھی کام کرے خواہشات پوری نہیں ہوں گی۔ ہر وقت نظر دنیا میں اوپر والے پر کہ فلاں ایسا، اس کا گھر ایسا، اس کی گاڑیاں ایسی، اسکی زندگی کا معیار ایسا اور دین کے معاملے میں اپنے سے نیچے والے پر۔ بیوی سے کہیں کہ نماز پڑھ لو تو وہ کہے گی کہ تیری بہن تو پڑھتی نہیں، یہ ہے اپنے سے نیچے والے پر نظر۔ اور اگر یہ نہیں کہے گی تو کہے گی کہ اچھا میں نے اپنی قبر میں جانا ہے تجھے کیا؟ تو دنیا کے معاملے میں اپنے سے اوپر والے کو اور دین کے معاملے میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھتے ہیں۔ ہماری بنیادی غلطی آج یہی ہے۔ حالانکہ مشائخ نے کہا ہے کہ آج ہم دین کے معاملے میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھیں کہ میں تو نمازیں پڑھتا ہوں اور فلاں آدمی تو تکبیر اولیٰ پر بھی عمل کر رہا ہے۔ میں تو فقط فرض نمازیں پڑھتا ہوں، فلاں آدمی تہجد بھی پڑھتا ہے۔ فلاں آدمی کیسا اچھا ہے ہمیشہ سچ بولتا ہے، وہ مجھ سے بہتر ہے۔ اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے نیچے والوں کو دیکھیں تو شکر کی کیفیت ہوگی کہ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنا کچھ عطا کیا ہے۔

رزق حلال میں ہمارے اکابر کی احتیاط:

تو مال کا پاک ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ یہ ناپاک مختلف طریقوں سے

ہوتا ہے۔ ایک تو جھوٹ، دھوکہ کی کمائی سے ناپاک جیسے ملاوٹ کر لی۔ دھوکہ دے دیا یا کوئی ایسا کام کرلیا جو سچ پر مبنی نہیں تو وہ کمائی ٹھیک نہیں۔ ہمارے مشائخ نے رزق حلال کا بہت خیال رکھا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ اپنی جوانی کی عمر میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ایک مرتبہ وہ دکان جلدی بند کر کے آرہے تھے۔ انہوں نے دکان اس لیے بند کر لی کہ آسمان پر بادل ہو تو گاہک کو کپڑے کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا اور کوئی گاہک کم قیمت کپڑے کو دھوکہ میں بیش قیمت سمجھ کر نہ خرید لے، اتنا رزق حلال کا خیال کیا جاتا تھا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اپنے ایک شاگرد کو بھیجا کہ جاؤ اور دال لے کر آؤ۔ وہ گیا اور اس وقت کا جو سکہ تھا وہ اس کے پاس تھا اور کہا کہ بھئی دال دے دو۔ دو دکاندار آمنے سامنے تھے، دونوں کے پاس دال اچھی تھی۔ ایک نے کہا کہ بھئی آپ مجھ سے دال لیں گے تو میں آپ کو ایک پیسے کے دو چمچ دوں گا جو کہ اصل قیمت بنتی تھی۔ دوسرے نے کہا کہ میں تین چمچ دوں گا۔ اب ان میں آپس میں کچھ مقابلہ بازی شروع ہو گئی حتیٰ کہ پانچ سات چمچ تک بات پہنچ گئی۔ شاگرد نے اس دکاندار سے جس نے سات چمچ کہا تھا پورا پیالہ بھر والیا اور دال لے کر گھر آ گیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جب دیکھا تو فوراً خیال آیا کہ پیسے تو تھوڑے لے کر گیا تھا اور دال کا پیالہ بھرا ہوا آیا ہے۔ پوچھا کہ بھئی یہ دال بھری ہوئی کیسے؟ اس نے کہا کہ میں نے

ایک سے لینا تھا دوسرے نے کہا کہ میں زیادہ دیتا ہوں اس نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ دیتا ہوں اور اس مقابلے بازی میں ایک نے سات چمچ دیئے اور میں نے لے لیے۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں میرا تو ایک ہی چمچ ہے جو میرے پیسے کا ہے اور باقی تو مقابلے بازی کا ہے جو میرے لئے جائز نہیں، اس لیے اس کو لے جاؤ یہ میرے کام کی نہیں۔ اب وہ لے کر گیا تو دکاندار دکان بند کر کے جا چکے تھے۔ حضرت وہ تو جا چکے، فرمایا: اچھا دال خراب ہونے والی چیز ہے، اب تم بازار میں جاؤ اور اگر تم سے کوئی خرید لیتا ہے تو تم کسی کو بیچ دو اور جو پیسے ملیں وہ کل اس کو واپس کر دینا۔ وہ شاگرد دال کا پیالہ لے کر بھرے بازار میں گیا کہ یہ دال ہے اور ایک چمچ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور باقی جو ہے وہ مقابلہ کی وجہ سے ملی ہے، یہ خرید لو۔ پورے شہر میں ایک آدمی بھی اس دال کا خریدنے والا نہیں تھا کہ یہ شبہ والی دال ہے ہم اسے کیوں خریدیں؟ کیسا وہ زمانہ ہوگا جب مسلمانوں کی زندگیوں میں اتنی احتیاط تھی کہ شبہ والی اس دال کو خریدنے والا پورے شہر میں کوئی بندہ نہ تھا۔ احتیاط زندگیوں میں تھی، حلال کھاتے تھے جس کے نتیجے میں مستجاب الدعوات بنا کرتے تھے۔ ان کی دعائیں قبول ہوا کرتی تھی۔

خزانہ نہ لینے پر مقدمہ:

رزق حلال کے معاملے میں بہت زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے حتی کہ تابعین کا واقعہ ہے اور بعض حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے زمین خریدی اور دوسرے نے بیچی۔ جب خریدنے والے نے اس میں ہل چلائے تو ایک جگہ سے اس میں خزانہ نکل آیا۔ اب وہ مالک کے پاس گیا کہ میں نے آپ سے زمین خریدی زمین کے اندر کا خزانہ تو نہیں خریدا، تو آپ اس کو لے لیجئے۔ وہ کہنے

لگا کہ جناب جب میں نے زمین بیچ دی تو زمین کے اندر سے جو کچھ نکلے گا وہ تمہارا ہے، قسمت تمہاری، یہ تمہارا مال ہے۔اب دونوں کا یہ اصرار تھا کہ یہ تمہار مال ہے۔ اب فیصلہ کون کرے؟ قاضی کی عدالت میں مقدمہ آیا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی زندگی ایک وقت میں ایسی تھی کہ مقدمہ یہ آیا کہ ہر آدمی کہہ رہا ہے کہ یہ دوسرے کا مال ہے اس کو دیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے قاضیوں کو بھی دید و دانش عطا کی تھی۔ چنانچہ قاضی صاحب نے عجیب قسم کا مقدمہ سنا اور اس کے بعد ان سے حالات زندگی پوچھے۔ پتہ چلا کہ ایک کا بیٹا جوان ہے اور ایک کی بیٹی جوان ہے، قاضی نے مشورہ دیا کہ تم اپنے بیٹے اور بیٹی کا آپس میں نکاح کر دو اور یہ خزانہ جہیز میں ان کو دے دو۔ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی زندگی میں حلال کے لیے اتنی کوششیں ہوا کرتی تھیں۔

حرام مال کا اثر:

اور آج تو لکڑ ہضم پتھر ہضم، جی چاہتا ہے لوگوں کا کہ دوسرے کے منہ سے نوالہ بھی چھین کر کھا سکتے ہیں نا تو وہ بھی چھین کر کھالیں۔ حالت یہ ہو چکی ہے تو مال کا پاک ہونا یہ انتہائی ضروری ہے۔ اس کو کہتے ہیں رزق حلال صدقِ مقال اور یہ تصوف کی دنیا میں بہت اہم بات ہے۔ اس پر عمل کیے بغیر کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان حرام کھاتا پھرے اور اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ حرام مال سے جو گوشت بنتا ہے وہ انسان کو حرام کاموں پر ابھارتا ہے۔ وہ نیکی نہیں کرواتا یہ اصول ذہن میں رکھیے۔ آج لوگ اپنے مال کو سود کے ذریعے سے ناپاک کر لیتے ہیں، زکوۃ نہیں دیتے۔ مختلف طرح سے مال ناپاک ہو جاتا ہے اور وہی اولاد کو کھلاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ فرمانبردار نہیں، پھر کہتے ہیں کہ وہ دین نہیں پڑھتی، دین کی طرف ان کا رجحان نہیں۔ جسم کا جو گوشت حرام مال سے

بن گیا وہ نیکی کے اندر سکون نہیں پائے گا۔ وہ ہمیشہ گناہ کی طرف لے کر جائے گا۔ اس لئے ہمارے سلف صالحین اپنی اولادوں کو حرام مال سے بہت بچایا کرتے تھے۔

بہت سال پہلے کی بات ہے ایک مدرسے میں ایک طالب علم پڑھنے کے لیے آیا کرتا تھا اور تھا بھی ہمارے قریبی تعلق والے صاحب کا بیٹا۔ کلاس میں بڑا اچھا، کلر ہولڈر، اے پلس نمبر لینے والا، لیکن ادھر قاعدے میں بھی نہیں چل رہا تھا۔ ایک سال اس کو پہلے ہی سپارے میں گزر گیا۔ اب ہم بھی بڑے پریشان کہ ایک سال اس بچے نے پڑھا، روز شام کو آکر پہلا پارہ سناتا، جہاں استاد آگے پڑھاتا پیچھے سے بھول جاتا۔ وہ محنت بھی کرتا، پڑھتا بھی رہتا استاد بھی دیکھتا کہ بیٹھا پڑھ رہا ہے مگر آگے پڑھتا تو "آگے دوڑ پیچھے چوڑ"۔ اب بڑا مسئلہ حتی کہ استاد نے آکر کہہ دیا کہ اس کو کسی اور کے حوالے کر دیں، میرے بس کی بات نہیں۔ اس بچے کو بلا کر اس سے پوچھا ذرا پیار محبت سے بات کی، بتاؤ بھئی! بچے کیا کیا کھاتے ہو؟ کہاں کہاں کھاتے ہو؟ اس نے ماشاء اللہ چار پانچ ہوٹلوں کے نام بتا دیئے۔ کہنے لگا کہ ابو اور امی مجھے فلاں جگہ سے یہ لے کر دیتے ہیں اور ویک اینڈ (ہفتہ وار چھٹی) پر فلاں جگہ جاتے ہیں۔ ہم نے پھر اس کے والد کو بلایا اور بلا کر کہا کہ بھئی! آپ ہمارے ساتھ ایک وعدہ کریں کہ آپ اس بچے کو اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلائیں گے، مسلمان ماں کا پکا ہوا کھانا اس کو کھلائیں گے تو دل میں نور آئے گا اور اس کا دل قرآن مجید کے انوارات سے محروم نہیں رہے گا۔ جب بات سمجھائی اس نے کہا بہت اچھا۔

اس نے اپنے بچے کو گھر کا کھانا کھلانا شروع کر دیا، اگلے ایک سال میں اس بچے نے پورا قرآن پاک پڑھ لیا۔ کہاں ایک سال میں ایک پارہ نہیں پڑھا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے اندر حرام تھا، جب حرام کا خون گردش کر رہا ہوتا ہے تو پھر قرآن پاک کے انوارات کو دل قبول نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر ہم اپنی اولادوں کے بارے

میں چاہتے ہیں کہ اچھے حافظ بنیں، اچھے عالم بنیں، نیک بنیں تو پھر ان کو رزق حلال کھلائیں تاکہ ان کا گوشت بھی رزق حلال سے بنے۔ پھر وہ خود بخود ان کو اللہ کی عبادت طرف متوجہ کرے گا۔ حرام کا گوشت انسان کو ہمیشہ حرام کاری پر اکسایا کرتا ہے۔

زکوٰۃ مال کو پاک کرتی ہے:

زکوۃ ادا کرنے سے انسان کا مال پاک ہوتا ہے یہ نہیں کہ حرام پاک ہوجاتا ہے نہیں۔ مال حلال کمایا ہے اگر زکوۃ ادا نہیں کرے گا اور صاحبِ نصاب ہے تو پھر بھی ناپاک ہوجائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

''اے میرے محبوب! ان کے مالوں سے زکوۃ وصول کر لیجئے ان کو پاک کرنے کے لیے اور ستھرا کرنے کے لیے۔''

تو زکوۃ ادا کرنے سے مال پاک ہوجاتا ہے اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انشورنس ہوجاتی ہے۔ اور اگر زکوۃ نہ دی جائے تو پھر پورا مال ناپاک ہوجاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں پورا کیا گیا۔ تو جسم پاک ہو، کپڑے پاک ہوں اور مال پاک ہو۔

اور اگر کبھی کوئی تنگی کا وقت آجائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں اس سے دعائیں مانگا کریں۔ شکوے زبان پر نہ لایا کریں۔

سنیے اور دل کے کانوں سے سنیے حدیث پاک میں آتا ہے جو بندہ دنیا میں تھوڑے رزق پر اللہ تعالیٰ سے راضی سے ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے تھوڑے عملوں پر راضی ہوجائے گا۔ تو یہ قدرت کی تقسیم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ﴾ (الزخرف:۳۲)

''ہم نے رزق کو ان کے درمیان تقسیم کیا ہے''

کسی کو زیادہ دے کر آزماتے ہیں کسی کو تھوڑا دے کر آزماتے ہیں۔ اپنی طرف سے محنت کیجیے اس کے بعد جو اللہ تعالیٰ دے دیں اس پر شکر کیجیے۔ بے صبری کا مظاہرہ نہ کریں۔

فاقوں کی قیمت بلخ کی بادشاہی:

ابراھیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ بلخ کے بادشاہ تھے، انہوں نے فقر کو اختیار کر لیا، ایک دن بیٹھے ہوئے فاقے کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ ایک ہوتا ہے کھانے کا مزہ اور ایک ہوتا ہے بھوک کا مزہ، ہم لوگوں کو کھانے کے مزے کا تو پتہ ہے بھوک کے مزے کا پتہ نہیں ہے۔ بھوک کے وقت میں آدمی کے لطائف میں اتنی ترقی ہوتی ہے کہ وہ اس کے اپنے وہم وگمان سے بھی بالاتر ہوتی ہے، اسقدر ترقی ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ بھوک بھی کوئی فضیلت والی چیز ہے جو آپ اس کے فضائل بیان کر رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ میاں تمہیں اس کے بارے میں کیا پتہ؟ ان فاقوں کی قیمت ہم سے پوچھو، جنہوں نے بلخ کی بادشاہی دے کر فاقوں کو خریدا ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائیں تو اس کے اوپر گھبرایا نہ کریں کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ جس پر تین دن فاقہ آئے اور وہ اس کو کسی پر ظاہر نہ کرے تو اب اس کی بخشش اللہ رب العزت کے ذمے ہو جاتی ہے۔

مثال سمجھیے! ایک آدمی کی بیٹی خوبصورت بھی نہ ہو، عقلمند بھی نہ ہو۔ نہ اس کے پاس تعلیم ہے، نہ شکل ہے، نہ عقل ہے کچھ بھی نہیں ہے اور ایک نوجوان اس سے نکاح کر لے اور اس کو بڑا خوش رکھے تو سسر اپنے دل میں اس کا احسان مند رہتا ہے کہ میری بیٹی اس قابل نہ تھی مگر یہ کتنا عظیم انسان ہے، کتنا اچھا آدمی ہے کہ اس نے میری

بیٹی کو خوش رکھا ہوا ہے۔ جس طرح دنیا میں بندہ احسان مند اور ممنون ہوتا ہے بالکل اسی طرح جب اللہ رب العزت کسی کو رزق کی تنگی دے دیتے ہیں اور پھر بھی وہ بندہ خوش ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ پھر اس بندے کی قدر دانی فرمایا کرتے ہیں۔ وہ بھی کہتے ہیں ہاں میرا بندہ میں نے جیسے بھی حالات بھیجے یہ مجھ سے راضی رہا، یہ میرا اچھا بندہ ہے۔

فاقے پر شکر:

ہم لوگ تو فاقوں سے ڈرتے ہیں، کمزور جو ہوئے لیکن ہمارے اسلاف تو بڑی ہمتوں والے تھے۔ وہ تو ان تنگیوں سے نہیں ڈرتے تھے، وہ تو خوش ہوتے تھے۔ ابراھیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے تو ایک بزرگ ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ان سے پوچھا کہ بتائیں کیسے گزارا چل رہا ہے؟ انہوں نے کہا: بھئی! جب مل جاتا ہے تو شکر ادا کرتا ہوں، جب نہیں ملتا تو صبر کرتا ہوں۔ تو آپ مسکرائے اور مسکرا کر کہا کہ یہ کام تو بلخ کے کتے بھی کرتے ہیں۔ ان کو بھی مل جاتا ہے تو شکر ادا کرتے ہیں نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ تو وہ بڑے حیران ہوئے، کہنے لگے کہ پھر آپ کا گزران کیسے ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جب ملتا ہے تو میں اللہ کے راستے میں اس کو خرچ کر دیتا ہوں اور جب نہیں ملتا تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ ملتا ہے تو اللہ کے راستے میں تقسیم کر کے آخرت کا ذخیرہ بناتا ہوں اور جب نہیں ملتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ میرا کون سا عمل تجھے پسند آیا کہ تو نے فاقہ میری طرف بھیج دیا، یہ چیز تو تو اپنے پیاروں کو بھیجتا تھا۔ میرا کون سا عمل تجھے پسند آیا کہ تو نے فاقہ میری طرف بھیج دیا۔

اللہ والوں کا تو یہ حال کہ فاقہ آئے تو شکر ادا کرتے ہیں اور ہمارا یہ حال کہ ملتا ہے پھر بھی ناشکری کرتے ہیں۔ اس معاملے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

بے حساب رزق:

حدیث پاک میں آتا ہے: نبی ﷺ نے گھر سے تیاری کی اور عید پڑھانے کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ کی زوجہ محترمہ نے عرض کیا: اے اللہ کے محبوب ﷺ! کچھ دیجیے کہ ہم گھر میں پکالیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں۔ انہوں نے پھر کہا: اے اللہ محبوب ﷺ! میں تو اس لیے مانگ رہی ہوں کہ عید کا دن ہے اور مدینہ کی بیوائیں اور یتیم ہمارے گھر آئیں گے اور آکر کچھ مانگیں گے تو کچھ نہ پکا تو ان کو انکار کیسے کریں گے؟ فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے محبوب ﷺ تشریف لے گئے، جب واپس تشریف لائے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے اندر بہت کچھ پکا ہوا ہے۔ بڑے حیران پوچھا کہ بھئی کیسے پکا؟ انہوں نے عرض کیا: کہ اللہ کے محبوب ﷺ! جب آپ تشریف لے گئے تو پیچھے عثمان غنی رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے اتنے اتنے اونٹ جو کھانے اور پینے کی اشیا سے لدے ہوئے تھے وہ آپ کی ہر ہر بیوی کو ہدیہ اور تحفہ دے دیئے۔ ماشاء اللہ۔ نبی ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اب دیکھیے کہ ضرورت ادھر ہے اور اللہ تعالیٰ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دل میں ڈال رہے ہیں کہ جاؤ اور میرے محبوب کے گھر ہدیہ پیش کرو۔ اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے پر راضی ہو جاتا ہے تو اس کو جب بھی ضرورت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے اس کا سبب بنا دیتے ہیں:

﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق:۳)

اللہ تعالیٰ ایسی طرف سے رزق دیتے ہیں جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ایسا رزق دیتے ہیں۔ تو طہارت کا پہلا درجہ کیا انسان بدن کو پاک رکھے، کپڑوں کو پاک رکھے اور اپنے مال کو پاک رکھے۔

تین کاموں کی وصیت:

اچھا ایک بات ابھی دل میں آئی اس عاجز کی طرف سے اس کو دل کے کانوں سے سنیے، نصیحت سمجھیے۔ نصیحت وصیت کے رنگ میں، کام آئے گی۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ میری بیس سالہ تصوف کی زندگی کا نچوڑ ہے کہ انسان ایک کام نہ کرے، ایک کام کم کرے اور ایک کام زیادہ کرے۔

...... پہلا کام جو نہ کرے وہ ہے علم اور ارادے سے گناہ کرنا۔ یہ کبھی نہ کرے۔ کیا کام نہ کرے؟ علم اور ارادے کے ساتھ گناہ کرنا یہ کام کبھی نہ کرے۔ بے دھیانی میں ہو جائے، بلا ارادہ ہو جائے اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔

...... ایک کام کم کرے، کھانا کھائے مگر جتنی بھوک ہو اس سے کم کھائے، اتنا نہ کھائے کہ پھنس کے ڈکار آئے۔

...... اور ایک کام جو بہت زیادہ کرے، وہ ہے اللہ کا ذکر۔

مشائخ نے لکھا ہے کہ جو انسان علم اور ارادے سے گناہ کرنا چھوڑ دیتا ہے اس کی روح سلامت ہو جاتی ہے۔ جو انسان کھانا کم کھانا شروع کر دیتا ہے اس کا جسم سلامت ہو جاتا ہے اور جو انسان اللہ کا ذکر یا نبی ﷺ پر درود شریف زیادہ بھیجنا شروع کر دیتا ہے، اس کا دین سلامت ہو جاتا ہے۔

یہ فتنوں کا دور ہے اور اس وقت دین کی فکر ہر بندے کو ہونی چاہئے۔ قرب قیامت کی علامات میں سے ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم دیکھو گے صبح ایک آدمی اٹھے گا ایمان والا ہوگا اور جب رات آئے گی تو ایمان سے خالی ہوگا۔ ایسے ایسے فتنے ہوں گے۔ اس لیے ان فتنوں سے بچنے کے لیے آپ کثرت سے ذکر کیجیے۔ نبی ﷺ پر درود کثرت سے پڑھیے۔ جس نے صبح اور شام ایک ایک سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا

وہ کثرت سے درود شریف پڑھنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (الانفال:۴۵)

’’تم کثرت سے ذکر کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ‘‘

تو کثرتِ ذکر کو فلاح کے ساتھ منتھی کر دیا۔ اس سے دین سلامت رہتا ہے، انسان فتنوں میں مبتلا نہیں ہوتا اور انسان کو اللہ تعالیٰ فلاح عطا کرتے ہیں۔

دوسرا درجہ

حواسِ خمسہ کا پاک ہونا

تو یہ پہلا درجہ تھا جسم کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا اور مال کا پاک ہونا۔ اس کے بعد دوسرے درجے پر مشائخ نے لکھا انسان کے حواس خمسہ کا پاک ہونا۔ کیا مطلب کہ آنکھ کا گناہوں سے پاک ہونا، زبان کا پاک ہونا، کانوں کا پاک ہونا، ہاتھوں کا پاک ہونا، ناک کا پاک ہونا۔ جو حواسِ خمسہ کہلاتے ہیں ان کا گناہوں سے پاک ہونا اور واقعی جو گناہ آج ہمارے ہیں اکثر و بیشتر وہ حواسِ خمسہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

دل سوز سے خالی ہے نگاہ پاک نہیں
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

اگر نظر پاک ہو، گناہوں کی ہوس ختم ہو جائے، زندگی کا مزہ آجائے گا۔ زبان سے انسان غیبت، چغلی، جھوٹ چھوڑ دے۔ اس قدر جھوٹ آج بولا جاتا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بات بدل کر کہہ دیتے ہیں اور اس کو برا نہیں سمجھتے۔ مردوں میں بھی بہت زیادہ مگر اللہ کی شان کہ عورتوں میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ کوئی معمولی سی بات

ہوگی بس بدل کر کر دیں گے۔ یہ بدل کر کرنا درحقیقت جھوٹ ہوتا ہے اور حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ بندہ جھوٹ بولتا رہتا ہے، بولتا رہتا ہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ جھوٹوں کے دفتر میں اس کا نام شامل کر دو۔ تو زبان کو جھوٹ سے، غیبت سے، چغل خوری سے، ان چیزوں سے بچا لیجیے۔ یہ زبان کا پاک ہونا ہے۔

کانوں کا پاک ہونا یہ کہ کانوں سے لایعنی مت سنیں، غیبت مت سنیں، ساز آواز اور موسیقی مت سنیں۔ یہ چیزیں کانوں کا گناہ ہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ''موسیقی کانوں کا زنا ہے'' اور ایک حدیث پاک میں آتا ہے: ''جس طرح بارش کے آنے سے زمین میں گھاس اگ آتی ہے اسی طرح موسیقی کے سننے سے دل میں زنا کی خواہش جنم لیتی ہے''۔ تو اپنے کانوں کو محفوظ کیجیے اسی طرح اپنے ہاتھوں کو گناہوں سے محفوظ کیجیے۔ تو یہ ہے حواس خمسہ کا پاک ہونا۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب انسان کی موت کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کئی فرشتوں کے ساتھ آتے ہیں اور وہ فرشتے آ کر انسان کے اعضا کو سونگھتے ہیں۔ یہ حدیث پاک کے الفاظ کا مفہوم ہے۔ جس جس عضو سے وہ گناہ کرتا ہوگا اس اس عضو سے ان کو بدبو آئے گی۔ آنکھوں سے بدبو، کانوں سے بدبو، منہ سے بدبو، ہاتھوں سے بدبو، دل دماغ سے بدبو۔ جب انہیں انسان کے اعضا سے بدبو آتی ہے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے رب کی نافرمانی کرتا تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ وہ سختی کے ساتھ اس کی روح کو قبض کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں یہ بھی ہے کہ جس عضو سے گناہ کریں گے اس عضو پر نجاست ہوگی۔ یہ گناہ نجاست کی مانند ہیں۔ اب بتائیے:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (التوبۃ: ۲۸)

''بے شک مشرکین نجس ہیں''

مشرکوں کو جو نجس کہا گیا تو کیا ان کے ظاہر پر کوئی نجس چیز لگی ہوتی ہے؟ نہیں ان کا عقیدہ ایسا، ان کی سوچ ایسی کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کی سوچ کو ناپاک کہہ کر ان کو نجس قرار دے دیا۔ اسی طرح اگر ہم گناہ کریں گے تو جس عضو سے گناہ کریں گے وہی عضو بدبودار بن جائے گا۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جو گناہگار ہوں گے ان کے پوشیدہ اعضا سے اتنی بری ہوا، اتنی گندی ہوا خارج ہوگی کہ اہلِ موقع جتنے بھی ہوں گے۔ وہ سب ناگواری کے ساتھ اس بندے کی طرف دیکھیں گے کہ کاش یہ تو یہاں نہ ہی ہوتا۔ تو اپنے اعضا کو گناہوں سے بچا لیجیے یہ اعضا پاک ہو جائیں گے۔

تیسرا درجہ
دل کا پاک ہونا

طہارت کا تیسرا درجہ ہے انسان کا دل بری آرزؤں سے پاک ہو جائے، گناہ کی خواہشات سے پاک ہو جائے۔ یہ جو گناہوں کی خواہشات ہوتی ہیں نا یہ دل کو ناپاک بنا دیتی ہیں۔ انسان کے دل میں گناہ کی خواہش نہ ہو کہ میں یہ کرلوں، میں وہ کرلوں، خواہش ہی نہ ہو۔ تو جب اس نے دل میں سے ایسی آرزؤں کو نکال دیا تو گویا اس نے اپنے دل کو پاک کر لیا۔ اپنی آرزؤں کو ہم بدل لیں اور دل کے رخ کو ٹھیک کرلیں۔ علامہ اقبال نے کہا ؎

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

کاش ہماری آرزوئیں بدل جائیں۔آج ہم نے کیا آرزوئیں بنائی ہوئی ہیں، دنیا کی چیزیں، دنیا کا دل پر راج ہے۔اپنے رب کی معرفت حاصل کرنے کو اپنی آرزو بنائیے، اس کے تعلق کو پانے کو اپنی آرزو بنائیے۔دین پر زندگی گزارنے کو اپنی آرزو بنائیے۔یہ دل کی تمنائیں ہیں اور ان تمناؤں سے انسان اللہ رب العزت کے قریب ہوتا ہے۔اور اس سے دل پاک ہوتا ہے۔جب بری آرزوئیں نکل جائیں گی تو پھر اچھی تمنائیں دل میں آجائیں گی۔

دل کو پاک کرنے کا مؤثر نسخہ:

اور اچھی تمنا یہی ہے کہ اللہ کی محبت دل میں آجائے، میں نیک بن جاؤں اور مجھے استقامت نصیب ہوجائے۔یہ اللہ کی محبت جس دل میں آجاتی ہے اس بندے کی زندگی میں بہار آجاتی ہے۔یہ محبت کثرتِ ذکر سے آتی ہے۔اور ذکر کا بنیادی مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ذکر سے ذاکر کو مذکور کی محبت نصیب ہوجاتی ہے۔تو جتنا کثرت سے اللہ کا ذکر کریں گے اتنی ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئے گی۔اس لیے ہمیں کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیا تاکہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھ جائے۔

محبتِ الٰہی کو تمنا بنائیں:

دل محبتِ الٰہی سے لبریز ہوجائے۔جب دل میں محبت الٰہی ہوگی پھر یہ دنیا کی چھوٹی موٹی چیزوں پر انسان غور ہی نہیں کرتا، اپنے رب پر راضی ہوتا ہے۔ہر حال میں اپنے اللہ سے راضی ہوتا ہے۔

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کہاں بیٹھ گئے
تیری محفل میں غنیمت ہے کہ جہاں بیٹھ گئے
ہے غرض دید سے ہم کو تکلف بھی نہیں
خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ ادھر بیٹھ گئے

جب اللہ کی محبت مطلوب ہوتی ہے تو پھر کھانے کو تھوڑا املا، سبزی ملی، یہ ملا وہ ملا، یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ مومن کی نظر میں یہ معمولی چیزیں بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے رب سے راضی ہوتے ہیں، وہ اپنے اللہ سے راضی سے ہوتے ہیں۔ تو اللہ رب العزت کی محبت کو دل میں بٹھا لیجیے۔ اس کو اللہ سے مانگیے۔ محبتِ الٰہی وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے۔ اسکی عظمت دیکھیے کہ اللہ کے محبوب خود بھی اسکو اللہ سے مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ حُبَّکَ)) (الترمذی، رقم: ۳۴۱۲)

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت کا سوال کرتا ہوں''

رحمۃ للعالمین، محبوب رب العالمین خود دامن پھیلاتے ہیں اور اپنے پروردگار سے اس کی محبت کا سوال کرتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ حُبَّکَ اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں، یہ بڑی نعمت ہے۔ یہ اگر نصیب ہو جائے تو پھر عبادات کا انداز ہی اور ہو جاتا ہے، پھر زندگی کا انداز ہی اور ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو تربیتی اجتماع ہے۔ اس کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکلے اور اللہ رب العزت کی محبت دل میں سما جائے۔ پھر دیکھیے کہ زندگی کا مزہ کیا آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو خوشیاں دے کہ چاروں طرف کفر اور گناہ کی ظلمت ہے اور آپ لوگ اپنے ایمان کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ سعادت مند ہیں آپ، خوش نصیب ہیں آپ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں یہ فکر دے دی ہے، یہ کڑھن

دے دی ہے کہ ہم نے اپنے ایمان کو بچانا ہے، ہم نے اپنے مولیٰ کو راضی کرنا ہے۔ اپنے اللہ کی محبت مانگیے، اس کی رضا مانگیے۔

ایک نکتے کی بات:

دیکھیے ایک نکتہ آپ کو سمجھا دوں ابھی دل میں آیا ہے۔ ایک ہوتا ہے اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنا، یہ بھی بڑی عظیم بات ہے اور ایک ہوتا ہے اللہ کی رضا مانگنا یہ اس سے بھی بڑھی ہوئی بات ہے۔ بات سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ایک ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگنا اور ایک ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا مانگنا۔ ارے نہیں دیکھتے دنیا میں اگر کوئی آقا کسی غلام سے ناراض ہوجاتا ہے تو اس غلام کے معافی مانگنے پر بسا اوقات وہ اس کی غلطی معاف کر دیتا ہے، مگر دل سے اس سے راضی نہیں ہوتا۔ غلطی معاف کر دیتا ہے، کہتا ہے ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں جانے دیتا ہوں لیکن دل سے راضی نہیں ہوتا۔ تو گناہوں کا بخشا جانا اور چیز ہے، غلطی معاف ہونا اور چیز ہے۔ اسلیے فقط گناہوں کی بخشش نہ مانگیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مانگیے۔ اے اللہ! ہم فقط گناہوں کی معافی نہیں مانگتے بلکہ ہم یہ مانگتے ہیں کہ آپ ہم عاجز مسکینوں سے راضی ہوجائیں۔ ہم آپ کی رضا چاہتے ہیں، آپ سے آپ کی محبت مانگتے ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی محبت مانگیں گے تو پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے جوش میں آئے گی۔

محبت الٰہی میں جان سے گزرنے والے:

اس دنیا میں اللہ رب العزت سے محبت کرنے والے کیسے کیسے گزرے؟ ان کے حالات و واقعات پڑھتے ہیں حیران ہوجاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کیسے کیسے محبت

کرنے والے گزرے ہیں۔

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب ایک واقعہ سناتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ گرمیوں کا موسم تھا چلچلاتی دھوپ تھی دوپہر کا وقت تھا۔حتی کہ پرندے بھی درختوں کے پتوں کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے تھے،انسان اپنے گھروں میں ٹھہر گئے تھے،جانور بھی نظر نہیں آتے تھے،پرندے اڑتے نظر نہیں آتے تھے،اتنی سخت گرمی کا عالم تھا۔فرماتے ہیں: میں نے ایک نوجوان کو دیکھا،وہ دونوں پاؤں سے معذور تھا،وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا،وہ تپتی دھوپ میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے آگے آگے کھسک رہا تھا۔فرماتے ہیں: جب وہ میرے قریب آیا اور میں نے اس نوجوان کو دیکھا،اس کا شگفتہ چہرہ تھا مگر دونوں پاؤں سے معذور تھا اور گرم زمین پر دونوں ہاتھ رکھے آگے آگے گھسٹ رہا تھا،پسینے میں شرابور تھا،میں نے اسے سلام کیا اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ کہنے لگا کہ میں اللہ کے گھر کے دیدار کے لیے جارہا ہوں۔میں نے پوچھا کہ کہاں سے چلے؟ کہنے لگا کہ میں فلاں ملک سے چلا ہوں۔میں نے پوچھا کہ کتنا وقت لگا؟ کہنے لگا کہ مجھے اپنے گھر سے چلے ہوئے دو سال ہوگئے ہیں۔میں دو سال سے اپنے ہاتھوں سے گھسٹ گھسٹ کر اپنے مالک کے گھر کی طرف جارہا ہوں۔میں نے کہا کہ تم تھوڑی دیر آرام کیوں نہیں کر لیتے؟ کہنے لگا مالک بن دینار! میں تمہیں عقلمند سمجھتا تھا مگر تم نے کہا کہ آرام کرلو،ارے! جس کو اپنے محبوب کو راضی کرنے کی فکر لگی ہوئی ہو تو وہ کیسے آرام سے بیٹھ سکتا ہے؟ اور تم تو پاؤں سے چل کر جاسکتے ہو اور مجھے تو گھسٹ گھسٹ کر جانا ہے،میرے پاس وقت تھوڑا ہے،اس لیے میں اپنے وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے اسے کہا کہ اے نوجوان! اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو کیوں نہیں سواری کا

بندوبست کر لیتے آرام کے ساتھ پہنچ جاؤ گے۔ کہنے لگے: اس نے میرے اوپر ایک عجیب اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر کہا: مالک بن دینار! میں تمہیں عقلمند سمجھتا تھا، اب پتہ چلا کہ آپ عقل سے بالکل خالی ہیں۔ میں نے پوچھا: نوجوان! وہ کیسے؟ کہنے لگا: جب کوئی غلام اپنے آقا کو ناراض کر بیٹھے اور پھر اس کو منانے کیلئے چلے تو بتاؤ وہ سواریوں پر سوار ہو کر جایا کرتا ہے یا پیدل چل کر جایا کرتا ہے۔ اس کی بات سن کر میں حیران ہوا، چنانچہ وہ اسی طرح گھسٹتا گھسٹتا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ فرماتے ہیں میں کافی دیر سوچتا رہا کہ اس بچے کے دل میں اللہ نے کیسی اپنی محبت ڈال دی۔

فرماتے ہیں اللہ کی شان مجھے اسی سال حج پر جانے کا موقع نصیب ہو گیا۔ میں منیٰ کے میدان میں تھا اور میں شیطانوں کو کنکریاں مار کر فارغ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ لوگوں کا بڑا مجمع لگا ہوا ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے، کہنے لگے کہ یہاں پر ایک نوجوان ہے اللہ کی محبت میں عجیب وغریب باتیں کر رہا ہے اور ہم سب اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ فرماتے ہیں میں مجمع کو چیر کر آگے بڑھا، میں نے دیکھا، وہی نوجوان احرام باندھے ہوئے زمین پر بیٹھا ہوا ہے، آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ رب العزت سے محبت کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ یہ کہہ رہا تھا میرے مولیٰ! تیری توفیق سے میں ہاتھوں کے بل گھسٹتا گھسٹتا تیرے گھر پہنچا، اللہ! تو نے مجھے طواف کی بھی توفیق دی۔ میرے مولیٰ! تو نے مجھے عرفات کے میدان میں بھی دعائیں مانگنے کی توفیق دی۔ تو نے مجھے مزدلفہ کا وقوف بھی عطا کیا۔ اللہ! میں نے شیطان کو کنکریاں مار کر اپنی بیزاری کا بھی اعلان کر دیا اور میرے مولیٰ! اب قربانی کا وقت ہے، یہ سارے غنی لوگ ہیں، یہ اپنے اپنے جانور قربان کر رہے ہیں، مگر اللہ! تو جانتا ہے میں فقیر آدمی ہوں، میرے جسم پر کپڑوں کے سوا کچھ نہیں، میرے پاس تو

میری جان ہے، کتنا اچھا ہو، اس قربانی کے بدلے تو میری جان کو قبول کر لے۔ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ اس نے کہے اور کلمہ پڑھا اور اس کی جان جانِ آفرین کے سپرد ہوگئی۔ یہ ہوتے ہیں اللہ رب العزت سے محبت کرنے والے جو اپنی جان اپنے پروردگار کے نام پر قربان کر دیا کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں بھی ایسی محبت عطا فرمائے اور ہمیں بھی اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل فرما دے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

(الحجرات: ۱۰)

ایک مینارۂ نور شخصیت

بیان: محبوب العلماء والصلحاء، زبدۃ السالکین سراج العارفین

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 30 نومبر 2007ء

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

موقع: خطبہ جمعۃ المبارک

اقتباس

اس کے والد نے پچاس ہزار درہم اپنے بیٹے کو تجارت کے لیے دیے۔ بیٹے نے پچاس ہزار درہم لیے اور علم حاصل کرنے کی نیت سے اپنے گھر سے چل پڑا۔ چنانچہ مختلف اساتذہ کی خدمت میں یہ سفر کر کے پہنچا، علم حاصل کیا، جب زادِ راہ ختم ہو گیا تو یہ واپس گھر لوٹا۔ باپ نے پوچھا بیٹے تم نے کیسی تجارت کی؟ جواب دیا کہ ایسی تجارت جو دنیا میں بھی فائدہ دیتی ہے اور آخرت میں بھی فائدہ دیتی ہے...... باپ نے پوچھا: بیٹا کون سی؟ اس وقت راز کھلا کہ سارا مال علم حاصل کرنے میں لگا دیا۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ایک مینارۂ نور شخصیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات:۱۰)
و قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (سنن نسائی: رقم ۴۹۱۰)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

بے مثال شخصیت:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:
((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (سنن نسائی، رقم ۴۹۱۰)
''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامتی میں رہیں''

جو دوسروں کو دکھ نہ دے، تکلیف نہ پہنچائے، جو اللہ کے بندوں کے لیے وبال جان بن کر نہ رہے۔ آج ایک ایسی شخصیت کی مثال آپ کے سامنے پیش کی جائے گی جس کو اللہ رب العزت نے علم کی تڑپ اور طلب دی تھی۔ علم کی پیاس تھی، پوری زندگی انہوں نے طالب علم بن کر گزاری اور ان کے اخلاق کی ایک بڑی نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کو دکھ نہیں دیتے تھے۔

خاندانی پس منظر:

چنانچہ حیران شہر میں ایک ترکی تاجر کا باغ تھا، جس میں سیب لگے ہوئے تھے، انار تھے، انگور تھے۔ یہ تاجر اللہ کے فضل سے خوب مالدار بھی تھا، دین دار بھی تھا۔ اس کو اللہ نے ایک چاند سی بیٹی عطا کی جو نیک بھی تھی اور اپنی شکل صورت میں رشکِ قمر بھی تھی۔ اس کے حسن و جمال کی عورتیں ایک دوسرے کو مثال دیا کرتی تھیں۔ تاجر اس سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح کس سے کروں؟ بڑے بڑے امرا نے اس کے لیے اپنے بیٹوں کے رشتے بھیجے لیکن اس تاجر کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا، ایک دن دل میں خیال آیا، کیوں نہ میں جا کر اپنے باغ کی سیر کر آؤں! یہ اپنا باغ دیکھنے کے لیے گیا۔ اس دوران اس کو پیاس لگی، اس نے باغ کے نگران کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تم میرے لیے انار کا جوس لے کر آؤ! وہ گیا اور ایک خوبصورت سا انار توڑ کے لے آیا۔ جب اس نے اس کا شربت پیا تو وہ انتہائی کڑوا تھا۔ اس نے اُس کو نصیحت کی کہ تم چوبیس گھنٹے باغ میں رہتے ہو تمہیں ابھی تک اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ کس درخت کے پھل میٹھے ہیں اور کس کے کھٹے ہیں۔ اس پر اس نوکر نے جواب دیا کہ جناب! آپ نے مجھے اس باغ کی نگرانی کے لیے رکھا ہے، باغ کے پھل کھانے کے لیے تو نہیں رکھا۔ مجھے جتنے سال بھی یہاں گزرے میں نے آج تک باغ کے کسی پھل کو نہیں چکھا۔ یہ بات اس تاجر کے دل کو لگ گئی کہ اس شخص کے دل میں اتنا تقویٰ! اتنا خوف خدا! اس قدر امانت کا لحاظ! کہ اس نے اتنے سالوں میں انار کو چکھا تک نہیں۔ ایسا آدمی بندوں کی خدمت کے لیے نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی خدمت کے لیے مخصوص ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اس سے کہا کہ تم یہاں سے بوریا بستر سمیٹو اور میرے ساتھ چلو۔ میرے گھر میں جا کر رہو اور سارا دن اللہ کی عبادت کرو۔

اس تقویٰ کی وجہ سے اس خادم کے دن بدل گئے، اب وہ سارا دن عبادت میں بھی گزارتا اور اسے تنخواہ بھی ملتی۔ ایک دن یہ تاجر اپنے اس خادم کے ساتھ بیٹھا تبادلہ خیالات کر رہا تھا، اس دوران اس نے کہا کہ آج کل میں بہت پریشان ہوں، میری بیٹی کے رشتے بہت جگہوں سے آ رہے ہیں، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کہاں رشتہ کروں؟ اس نے اس کو جواب دیا کہ دیکھیے! یہود کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ مال کے پرستار ہیں، نصاریٰ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جمال کے پرستار ہیں جبکہ ہمارے نبی ﷺ نے مال اور جمال کو مقدم نہیں کیا بلکہ اعمال کو مقدم کیا اور یہ فرمایا کہ

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (الحجرات:۱۰)

''اللہ کے نزدیک تو وہ معظم ہے جو متقی ہے''

لہٰذا کوئی نیک رشتہ اگر آپ کو ملے تو نبی علیہ السلام کی تعلیمات پر آپ عمل کر لیں۔ تاجر کے دل کو یہ بات اچھی لگی، اس نے جا کر اپنی بیوی کو یہ بات بتائی تو دونوں نے اس نقطہ نظر سے رشتوں کو دیکھنا شروع کر دیا کہ نیک کون ہے؟ چنانچہ بیوی نے کہا: پھر یہی ہمارا جو باغ کا خادم ہے، نیکی میں تو اس جیسا نوجوان ہمیں مل ہی نہیں سکتا، کیوں نہ ہم بیٹی کا رشتہ اس سے کر دیں؟ بالآخر اس ترکی تاجر نے اپنی اس نیک صورت، نیک سیرت بیٹی کا نکاح اس خادم کے ساتھ کر دیا۔ اس کا نام تھا مبارک۔ مبارک کی شادی ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش:

اب خاوند بھی نیک اور بیوی بھی نیک، اللہ رب العزت نے انہیں ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام انہوں عبداللہ رکھا۔ چونکہ یہ نام اللہ رب العزت کو بہت پسند ہے۔ یہ اسلام کے بہت روشن دور کا واقعہ ہے جسے تابعین کا دور کہتے ہیں۔

قُرُوْنٌ ثَلٰثَةٌ مَشْهُوْدٌ لَهَا بِالْخَيْرِ

تین دور ایسے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے جس میں خیر کے غالب ہونے کی خود گواہی عطا فرمائی، فرمایا:

((خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ))

(مسند البزار، رقم: ۴۵۰۸)

''سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر اسے کے بعد والا اور پھر اس کے بعد والا''

چنانچہ یہ بچہ 118 ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے کچھ عرصہ کے بعد تر کی تاجر فوت ہو گیا۔ چونکہ اس کی ایک بیٹی تھی لہٰذا اس کی پوری جو وراثت تھی، اس کا حق دار وہی بنی۔ مبارک کے ہاتھ میں وہ سارا مال و دولت آ گیا۔

بچپن اور جوانی:

انہوں نے اپنے بچے کی اچھی تربیت کرنے کی کوشش کی مگر بچے جب ناز و نعمت میں پلتے ہیں تو غفلت تو آ ہی جاتی ہے، لہو لعب میں دل لگتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بھی اسی لائن میں چل نکلا۔ اس کا کام سارا دن نوجوانوں کے ساتھ کھیلنا، باتیں کرنا، دن رات اسی کام میں لگے رہنا۔ ماں باپ کا دل تڑپتا کہ ہمارا بچہ نیک بنے، لیکن جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ بندے کو جب اپنی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے تو یہ آدھی سے زیادہ گزر چکی ہوتی ہے، عبداللہ بھی انہی لوگوں میں تھا۔ ماں باپ کی دعاؤں کے باوجود، نصیحتوں کے باوجود، یہ اپنے دوستوں کی محفل میں ہر وقت لگا رہتا۔ ماں باپ دعائیں کرتے اللہ کے حضور مانگتے، مگر ماں باپ کی دعائیں رائیگاں نہیں جاتی۔ عین عالمِ جوانی میں ایک دن عبداللہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے:

﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الحدید: ۱۶)

''کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے ڈر جائیں۔''

یعنی وہ گناہوں سے باز آ جائیں۔ آنکھ کھلی تو دل کی حالت بدل گئی تھی۔ سوچا میں کب تک اپنے اللہ کی نافرمانی کروں گا، میں کب تک اپنے مالک کی نعمتوں کی ناشکری کرتا پھروں گا۔ چنانچہ دل میں سچی توبہ کی نیت کر لی مگر اپنے والدین کو اس سے آگاہ نہیں کیا۔

علم کے لیے سفر:

جب باپ نے دیکھا کہ بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں تو اس نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا اب آپ پھر تجارت کر لو۔ اس کے والد نے پچاس ہزار درہم اپنے بیٹے کو تجارت کیلیے دیے۔ بیٹے نے پچاس ہزار درہم لیے اور علم حاصل کرنے کی نیت سے اپنے گھر سے چل پڑا۔ چنانچہ مختلف اساتذہ کی خدمت میں یہ سفر کر کے پہنچا، علم حاصل کیا، جب زادِ راہ ختم ہو گیا تو یہ واپس گھر لوٹا۔ باپ نے پوچھا بیٹے تم نے کیسی تجارت کی؟ جواب دیا کہ ایسی تجارت جو دنیا میں بھی فائدہ دیتی ہے اور آخرت میں بھی فائدہ دیتی ہے۔ ایسی تجارت جو

﴿تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (صف:۱۰)

''دردناک عذاب سے نجات دیتی ہے''

باپ نے پوچھا: بیٹا کون سی؟ اس وقت راز کھلا کہ سارا مال علم حاصل کرنے میں لگا دیا۔ باپ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا بیٹا میرے سامنے یہ بات کہہ رہا ہے۔ اس کا تو خواب پورا ہو گیا۔ اس نے بیس ہزار درہم اور دے دیے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ پھر چلے اور انہوں نے وہ بیس ہزار درہم بھی علم کی طلب میں خرچ کر دیے۔ اتنا سفر کیا کہ شام، مصر، ایران، حجاز اور یمن ان علاقوں کا

کوئی نمایاں عالم ایسا نہیں تھا جس سے انہوں نے علم حاصل نہ کیا ہو۔ ان کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں چار ہزار اساتذہ سے علم حاصل کیا۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے زمانے میں علم کے حصول کے لیے سفر کرنے والا عبداللہ سے زیادہ اعلیٰ انسان کوئی نہیں تھا۔ طلبِ علم میں اس قدر انہوں نے کوشش کی۔

اساتذۂ کرام:

وہ زمانہ تو تھا ہی فقہا اور محدثین کا۔ جو ان کے نمایاں استاد تھے وہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر انہوں نے دین میں تفقہ حاصل کیا، فقیہ وقت بن گئے۔ چنانچہ اکثر وقت ان کے پاس گزارا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اصولِ فقہ مرتب کیے اور ان کی مجلس میں چالیس ایسے حضرات تھے جو بڑے محدث تھے، فقیہ تھے، اور وہ ان کے ساتھ رہ کر مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ، انہیں چالیس حضرات میں سے ایک عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

چنانچہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کوفہ سے شام کی طرف سفر کر کے گیا تو امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا: اے خراسانی! یہ کوفہ میں کون عالم ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دین میں اپنی رائے کو داخل کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی بات کو سن لیا اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الرھن میرے پاس تھی، میں نے ان کو مطالعے کے لیے وہ کتاب دے دی۔ چند دن کے مطالعے کے بعد مجھے کہنے لگے: اے خراسانی! یہ کس عالم کی کتاب ہے؟ اگر تجھے موقعہ ملے ان کے قدموں میں جگہ بنا اور ان کے علم کو حاصل کرنے میں زندگی خرچ کر دے۔ اس وقت میں نے ان کو بتایا کہ یہی بزرگ

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

مشرق ومغرب کے عالم:

چنانچہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو مشرق اور مغرب کا عالم کہا کرتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے ان کو عالمِ مشرق کہہ دیا کہ مشرق کا عالم۔ کہنے لگے: نہیں ان کو مشرق اور مغرب دونوں کا عالم کہو! جب انہوں نے یوں علم حاصل کرنے میں اپنی محنت کھپا دی تو اللہ رب العزت نے انہیں بہت علم عطا کیا۔ جیسے اسفنج پانی میں ڈال دیا جائے تو کیسے پانی کو چوس لیتا ہے، اس کی نس نس میں پانی سما جاتا ہے، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی بالکل یہی حالت تھی۔ جہاں جاتے تھے اپنے استاد کے علم کو یوں حاصل کرلیا کرتے تھے۔ ایک ایسا وقت آیا کہ لوگوں نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ حدیث کا درس دیا کریں۔ پھر تو اللہ کے بندوں کا ایسا رجوع ہوا، ہزاروں لوگ ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔

اس زمانے میں یہ ساؤنڈ سسٹم تو ہوتے نہیں تھے۔ جب یہ حدیث کی تلاوت کرتے تو اس کو سن کر دوسرے لوگ آگے لوگوں کو سناتے تھے، جیسے مکبر ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی مجلسِ حدیث میں ان حدیث سنانے والوں کی تعداد گنی گئی تو وہ بارہ سو نکلی۔ اب جس مجمعے میں بارہ سو مکبر ہوں وہ مجمعہ کتنا بڑا ہوگا۔ ایک مرتبہ ان کے مجمعے میں دواتوں کی تعداد گنی گئی۔ اس زمانے میں لوگ حدیث پاک کو قلم دوات سے لکھا کرتے تھے اور ایک دوات سے کئی کئی لوگ اپنی قلم سیاہی کے ساتھ لگایا کرتے تھے۔ تو ان کی محفل میں چالیس ہزار دواتیں تھیں۔ اب جب دواتیں چالیس ہزار ہوں تو مجمع کتنا ہوگا۔

دلوں کا بادشاہ:

چنانچہ ایک مرتبہ یہ شہر رفاع تشریف لے گئے۔ پورا شہر ان کی علمی شہرت کو سن کر

ان سے حدیث سننے کے لیے شہر سے باہر نکل آیا۔ تو اس وقت ہارون رشید کی ایک لونڈی خادمہ وہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی، اس نے اس منظر کو دیکھ کر کہا: ''ہارون الرشید تو لوگوں کے جسموں کا بادشاہ ہے اور یہ شخص لوگوں کے دلوں کا بادشاہ ہے۔ ہارون رشید کی خاطر تو لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے پولیس آتی ہے اور اس شخص کے لیے علم لوگوں کے دلوں کو کھینچ کے اکٹھا کر دیتا ہے۔'' چنانچہ علمائے وقت ان کا بڑا اکرام کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب یہ جاتے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان کو اپنی مسند پر، اپنی جگہ پر بیٹھایا کرتے تھے۔

اخلاق وصفات

اللہ رب العزت نے ان کو چند صفات سے نوازا تھا۔ طلبا کو چاہیے کہ وہ ان صفات کو ذرا توجہ سے سنیں اور اپنے اندر ان کو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

دوسروں کا دل خوش کرنا:

علم ایک ایسی پیاس ہے جو زندگی بھر کبھی نہیں بجھتی۔ علم ایک ایسا روگ ہے جس کا علاج علم کی طلب کے سوا دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔ ایک نشہ ہے یہ بندے کو جب لگ جاتا ہے تو پھر اس کے اندر وحدتِ مطلب آجاتی ہے۔ وہ ہر طرف سے ہٹ کٹ کے علم کی طلب میں اپنا وقت گزارتا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے ان کو تفقہ فی الدین عطا فرمایا مگر ان کے اخلاق کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ لوگوں کا دل خوش کیا کرتے تھے، کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ کچھ مثالیں سن لیجیے:

☆......ایک مرتبہ اپنے ایک غلام کے ساتھ حج پر نکلے، راستے میں دیکھا کہ ایک چھوٹی عمر کی لڑکی ہے اور وہ ایک مرے ہوئے پرندے کو اٹھا کر لے جا رہی ہے۔ بلا کر پوچھا کہ تم نے مرے ہوئے پرندے کو کیوں اٹھایا؟ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ کہنے لگی: میں ایک یتیم بچی ہوں گھر میں کوئی مرد نہیں جو کما کر لے آئے اور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہوں اور کئی کئی دن ہمارے فاقے میں گزر جاتے ہیں، آج پانچواں دن ہے فاقے کا، میں اسی پرندے کو اٹھا کے لے جا رہی ہوں، اس کا گوشت پکا کے کھائیں گے، کم از کم اپنا فاقہ تو ختم کریں گے۔ یہ سن کر عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا دل تڑپ اٹھا۔ اپنے غلام سے پوچھا کہ بتاؤ! یہاں سے ہمیں گھر واپس جانے کے لیے کتنے خرچ کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا: بیس درھم۔ فرمایا کہ بیس درہم اپنے پاس رکھ لو اور باقی جتنا پیسا ہے اس بچی کو دے دو۔ اس نے کہا: جی آپ نے تو حج کا ارادہ کیا تھا۔ فرمایا: اس حاجت مند بچی کی ضرورت کو پورا کرنا میرے اللہ کے نزدیک حج کرنے سے زیادہ افضل ہے۔ چنانچہ وہیں سے واپس آ گئے۔

☆......حج پر جاتے تھے کیونکہ امیر باپ کے بیٹے تھے۔ اللہ نے بچپن سے ان کو مال و دولت کی فراوانی دی تھی۔ سونے کی چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ تو اس زمانے میں لوگ ان کے پاس آتے جی میرے پاس پیسے ہیں آپ سفر میں ان کو امانت رکھ لیں۔ تو یہ سب کے پیسے لے کر ایک گٹھی میں ڈال دیتے الگ الگ مقدار اور نام لکھ دیتے اور سفر میں جب وہ خرچ کے لیے مانگتے تو ان کو خرچ کے لیے دیتے رہتے۔ جب پوچھتے جی ہمارے کچھ پیسے باقی ہیں تو کہتے: ابھی بہت پیسے ہیں، آپ خرچ کریں۔ لوگ خوب دل کھول کر پیسا خرچ کرتے اور جب حج کے بعد لوگ آتے کہ جی ہمارا اگر کوئی پیسا بچا ہے تو بتا دیجیے۔ تو جتنے پیسے انہوں نے جمع کروائے تھے وہ سارے پیسے ان کو واپس لٹا دیتے اور کہتے کہ آپ کے سفر خرچ کا سارا خرچ میں نے اٹھا لیا۔ لوگ کہتے کہ جی آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ تو فرماتے کہ اگر میں پہلے بتا دیتا تو آپ خرچ ہی نہ کرتے۔ اس کو کہتے ہیں دین کی سمجھ۔ تو اس طرح یہ اپنا مال اللہ کے بندوں پر خرچ کرتے تھے۔

☆......دوسروں کا دل خوش کرنے کی ان کو اتنی فکر ہوا کرتی تھی کہ ایک مرتبہ ایک آدمی ان کے پاس آیا، اس کے اوپر سات سو درہم کا قرضہ تھا۔ اس نے کہا کہ جی میں سات سو درہم کا مقروض ہوں مجھے کچھ دے دیجیے۔ انہوں سات ہزار درہم کی چٹ بنا کر اپنے خادم کی طرف بھیج دیا۔ اس نے خادم کو جا کر چٹ بھی دکھائی کہ جی مجھے رقم دے دیجیے۔ خادم نے پوچھا کہ کتنا قرضہ ہے؟ اس نے کہا کہ سات سو دینار۔ بھئی ادھر تو سات ہزار لکھا ہوا ہے، غلطی تو نہیں ہو گئی میں ذرا جا کر پوچھ لوں۔ خادم ان سے پوچھنے کے لیے آیا کہ جی کہیں غلطی سے تو سات ہزار نہیں لکھا۔ انہوں نے وہ چٹ لے لی اور دوسری چٹ چودہ ہزار کی بنا دی کہ جاؤ اسے یہ دے دو۔ اس نے پیسے تو دے دیے لیکن بڑا حیران کہ اس اللہ کے بندے نے کیا کیا؟ جب وہ نوجوان چلا گیا جس نے قرض لیا تھا تو اس نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آ کر پوچھا کہ سات سو کی جگہ سات ہزار کیوں لکھا؟ انہوں نے کہا: اس لیے کہ میں ان کے دل کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ پھر کاٹ کر چودہ ہزار کیوں لکھا؟ اس لیے کہ تم نے اسے بتا دیا تھا۔ اب سات ہزار دینے سے اس کا دل خوش نہ ہوتا میں نے اس کو چودہ ہزار لکھ دیا۔ اس نے پوچھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو انہوں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث سنائی کہ اللہ پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص کسی مؤمن کے دل کو خوش کرتا ہے اللہ تعالیٰ زندگی کے پچھلے سب گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔

کیا ہم اپنے ماں باپ کا دل خوش کرتے ہیں؟ کیا ہم اپنے اساتذہ کا دل خوش کرتے ہیں؟ کیا ہم اپنے ہمسائیوں کا دل خوش کرتے ہیں؟ اپنے بڑوں کا چھوٹوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ اگر اس بارے میں سوچیں گے تو شرم سے ہمارا سر جھک جائے گا۔ اللہ کے بندوں کو دکھ دیتے پھرتے ہیں، اللہ کے بندوں کے وبال جان بنے پھرتے ہیں۔ بے سینگ کے جانور ہیں اِسے ٹکر لگا دیتے ہیں، اُسے ٹکر لگا دیتے ہیں۔

ایسے لفظ بول دیتے ہیں کہ دوسرے کا دل ٹوٹتا ہے اور ہمیں پرواہی نہیں ہوتی۔ اسلام ہمیں کسی اور چیز کی تعلیم دیتا ہے۔

عبادت کا شوق:

عبادت کا اتنا شوق تھا کہ انہوں نے اپنے پورے سال کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ سال کا کچھ حصہ حدیث پاک کے پڑھنے اور پڑھانے میں لگا دیتے تھے۔ سال کا ایک حصہ حج کے سفر میں لگا دیتے تھے، سال کا تیسرا حصہ یہ اللہ کے راستے جہاد میں لگا دیا کرتے تھے۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت کے اتنے بڑے فقیہ تھے، فرمایا کرتے تھے کہ کاش میری پوری زندگی عبداللہ ابنِ مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے تین دن کے برابر ہو جاتی۔ انہوں نے حدیث پاک میں اتنا کمال حاصل کیا کہ اکیس ہزار حدیثیں ان سے روایت ہوئی ہیں۔

انہوں نے کوفہ میں ایک چھوٹا سا مکان لیا اور بس وہیں رہتے تھے۔ صرف نماز کے لیے نکلتے اور پھر اسی مکان میں آجاتے اور اتنا روشنی کا انتظام بھی نہیں تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اتنے چھوٹے سے مکان میں رہ کر آپ کا دل نہیں گھبراتا؟ تو جواب میں کہنے لگے کہ سبحان اللہ جو شخص ہر وقت نبی علیہ السلام کی مجلس میں وقت گزارتا ہو بھلا اس دل کیسے تنگ ہو سکتا ہے؟ یعنی حدیثِ پاک پڑھنے اور یاد کرنے کو انہوں ان الفاظ سے کہا کہ میں تو ہر وقت نبی علیہ السلام کی مجلس میں وقت گزارتا ہوں۔ اب جس کے دل میں حدیث پاک کی ایسی عظمت ہو، نبی علیہ السلام کے ساتھ ایسی محبت ہو تو اس کو پھر باہر کی دنیا میں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی لیے لوگوں نے انہیں امام المسلمین اور امیر المؤمنین فی الحدیث کے الفاظ سے یاد کیا۔

طبیبِ حدیث:

چنانچہ اسماء الرجال کی کتب میں، حدیث کے مختلف راویوں کے بارے میں اپنے

اپنے تاثرات بیان کیے گئے۔ فقہا نے اور تمام ناقدین نے، محدثین نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اتنے اچھے الفاظ استعمال کیے کہ ایسے الفاظ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بھی استعمال نہیں کیے گئے۔ متفقہ طور پر اللہ رب العزت نے ان کو حدیث میں یہ مقام عطا کیا تھا۔ چنانچہ جب علما میں کوئی بات ہوتی تھی کہ فلاں حدیث کے بارے میں کیا سمجھتے ہو؟ لوگ کہتے تھے کہ طبیبِ حدیث عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں پوچھو۔ جیسے طبیب ہوتا ہے نا جو کھرے کھوٹے کو پہچانتا ہے، اصلی نقلی کو پہچانتا ہے، تو اپنے زمانے میں عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ طبیبِ حدیث کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

اُمرا سے بے نیازی:

اپنے وقت کے جو امرا تھے ان سے بڑا بے نیازی کا سلوک کرتے تھے۔ وقت کے حاکموں کے دروازے پر نہیں جاتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کچھ فتنے ایسے ہیں جو امیروں کے دروازوں پر قدم جمائے ہوتے ہیں، جو انسان ان کے دروازوں پر چکر لگاتا ہے، وہ ان فتنوں میں گھر جاتا ہے۔ چنانچہ اسمٰعیل ان کے ایک دوست تھے انہوں نے حکومتِ وقت میں کوئی عہدہ قبول کر لیا تو انہوں نے ان سے ملنا ہی چھوڑ دیا اس نے کہا کہ کیا بات ہے پہلے اتنی دوستی تھی اب ملتے ہی نہیں۔ فرمایا کہ مجھے تیرے ایمان کا ہی ڈر رہتا ہے کہ پتہ نہیں کہ کہیں وہ بھی نہ سلب ہو جائے۔ اس لیے کہ تم لوگوں پر کہیں ظلم کرنے والے نہ بن جاؤ، اس بات کو سن کر اسمٰعیل توبہ تائب ہوئے اور انہوں نے پھر علم کی خدمت میں وقت گزارا۔

اخفائے اعمال:

ان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ یہ اپنے اعمال کو چھپایا کرتے تھے۔

اور یہی کتابوں میں لکھا ہے کہ عالم کو چاہیے کہ اس کے نامۂ اعمال میں ایسے بھی اعمال ہوں جس کو وہ جانتا ہو یا اس کا پروردگار جانتا ہو، کوئی دوسرا نہ جانے۔ آج کے طلبا ذرا اس پیمانے پر تو اپنے آپ کو تول کے دیکھیں، کیا ہمارا کوئی ایسا عمل ہے جو ہم نے اتنا اللہ کے لیے خالص ہو کر کیا ہو کہ کسی کو پتہ ہی نہ ہو کہ ہم نے کیا کیا؟ اوّل تو ایسے اعمال کرتے نہیں اور کرتے ہیں تو دوسروں کو بتاتے پھرتے ہیں۔

چنانچہ ان کے بارے میں آتا ہے کہ یہ کوفہ کا سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک جگہ پر سرائے میں رکا کرتے تھے۔ وہاں ایک نوجوان تھا جو ان کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب آئے تو انہوں دیکھا کہ وہ نوجوان موجود نہیں، پوچھا کہ وہ نوجوان کہاں گیا؟ لوگوں نے کہا کہ جی کسی وجہ سے اس کو پکڑا گیا ہے اور وہ تو جیل میں ہے۔ انہوں نے پتہ کرایا کہ اس آدمی کے چھوٹنے کی کیا ترکیب ہو سکتی ہے؟ بتایا کہ اس نے کسی شخص کا قرضہ دینا تھا، وہ دیا نہیں اس لیے جیل میں ہے۔ قرضہ ادا ہو جائے گا تو باہر آجائے گا۔ وہ پانچ ہزار دینار تھے، انہوں نے پانچ ہزار دینار جا کر ادا کر دیے اور کوتوال سے کہا کہ اس نوجوان کو آزاد کر دے۔ اور وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ اس نوجوان کو جب آزاد کیا گیا تو وہ حیران ہوا کہ میرا قرضہ کس نے ادا کیا؟ اس کو پتہ نہیں چلا۔ پوری زندگی وہ پتہ کرتا رہا اس کو کسی نے نہ بتایا۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اس کو پتہ چلا کہ میرا قرضہ انہوں نے ادا کیا تھا۔

یہ ہوتے ہیں اللہ والے کہ جو دوسروں کے دکھ بانٹتے ہیں، دوسروں کے غم شیئر کر لیتے ہیں مگر دوسروں کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ اپنی نیکیاں چھپاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ دوسروں سے اپنے گناہوں کو چھپاتے ہیں، اللہ والے اس طرح دوسروں سے اپنی نیکیوں کو چھپایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں نیکیوں کا اجر اللہ سے چاہیے، دنیا کی واہ واہ سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ پانی کی ایک سبیل لگی ہوئی تھی اور پینے والوں کا رش تھا۔ کیونکہ گرمی کا موسم تھا، یہ بھی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ عجیب اللہ کی شان کہ جب دھکا لگا تو یہ بھی نیچے گر گئے۔ نیچے گر کر جب اٹھے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ الحمد للہ میرے اس علم کے باوجود مجھے ایسی گمنامی کی زندگی عطا کی کہ مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں ہے۔ جب بندے کے دل میں یہ نیت ہونا کہ میں اپنے آپ کو ایسے مٹا دوں کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو آسمانِ شہرت کا ستارہ بنا کر چمکا دیا کرتے ہیں۔ اللہ ان کے تذکرے دنیا میں پھیلا دیا کرتے ہیں۔ آج تو جس بندے کو دیکھو اس کو چھپنے کا شوق ہے، ہمارے بزرگ چُھپنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ تو ہم ایسے اعمال کریں جو خالص اللہ کی رضا کے لیے ہوں۔ کیا کوئی طالب علم ایسا ہے جو کسی معذور کی خدمت کرتا ہو، کسی نادار کی خدمت کرتا ہو، محتاج کی خدمت کرتا ہو اور اس کا یہ عمل اس کے اور اللہ کے درمیان ہو۔ اس کے بارے میں کسی کو نہ پتہ ہو۔

عزیز طلبا! اس کو زندگی کا ایک نصب العین بنائیے کہ اس طرح ہم نے نیکی اور عبادت کرنی ہے کہ کسی دوسرے کو اس کی خبر ہی نہ ہو۔

عالم بھی اور تاجر بھی:

عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اس علم کے ساتھ تجارت بھی کیا کرتے تھے اور اللہ رب العزت نے ان کی تجارت میں خوب برکت عطا فرمائی تھی۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زہد اس کو کہتے ہیں کہ جو مال ملے بس سارا ہی لٹا دو۔ خرچ کی ایک ترتیب ہو انسان کے پاس کچھ مال رہے جو اس کی ضروریات میں اس کے کام آئے اور اس کو دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ آج کے دور میں مال انسان کے ایمان کے لیے ڈھال ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْراً)) (شعب الایمان، رقم: ۶۶۱۲)

''قریب ہے کہ تنگدستی تمہیں کفر تک نہ لے جائے''

چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ سعد! تم اس حالت میں دنیا سے جاؤ کہ تمہارے ورثا کے پاس مال ہو، یہ اس سے بہتر ہے کہ تمہارے پیچھے تمہارے وارث دنیا سے بھیک مانگتے پھریں۔ سعید بن مسیّب فرماتے تھے وہ آدمی کسی کام کا نہیں جس نے علم کی عزت آبرو کے لیے اپنے پاس مال کو جمع نہ کیا۔ یعنی اپنی ضرورت کے لیے اپنے پاس مال کو رکھے۔ مقصود کیا کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

چنانچہ عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے بڑے محدث اور عالم ہیں اور پھر بھی تجارت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ زندگی امیروں کی طرح استغنا کے ساتھ گزاروں مگر اللہ مجھے موت مساکین کے ساتھ دے دے۔ کیونکہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ)) (سنن الترمذی، رقم:۲۵۲۶)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا خوفِ خدا:

ایک بڑی صفت اللہ تعالیٰ نے عبداللہ ابنِ مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی وہ تھی ''خوفِ خدا''۔ انسان کا علم بڑھے تو چاہیے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی خشیت بھی بڑھتی جائے۔ جب علم بڑھے لیکن خشیت نہ بڑھے تو سمجھ لے یہ علم نہیں میرے لیے وبال ہے۔

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸)

تو علم خشیت کا دوسرا نام ہے۔ اسی لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عالم وہ ہے جس پر گناہوں کی مضرتیں زیادہ کھل جائیں، گناہوں کے نقصانات جس

زیادہ واضح ہو جائیں، وہ شخص اتنا بڑا عالم ہوا کرتا ہے۔ اب جب گناہوں کے نقصانات کھل جائیں گے تو بندہ ان کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا، یہ عالم کی پہچان ہے۔

اور آج کے دور کا طالب علم کیا اس طرح گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بولیں تو زبان سے غیبت نکل رہی ہو، جھوٹ نکل رہا ہو، باہر نکلیں تو آنکھ غلط دیکھ رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ علم کا رنگ ہمارے اوپر نہیں چڑھ رہا۔ اس لیے نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ

خَشِيَّةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَ الْعَلَانِيَةِ

''خلوت میں اور جلوت میں اللہ تعالیٰ کی خشیت ہو۔''

تنہائی میں دنیا تو نہیں دیکھتی، مگر دنیا کا پروردگار تو دنیا میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔

ہم گناہوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں گے اس کے بدلے اللہ تعالیٰ ہمیں علم کی لذت عطا فرما دیں گے۔ جیسے ایمان کی حلاوت ہوتی ہے۔ جب وہ دل میں آجائے تو بندے کو سولی پر بھی چڑھا دیا جائے تو بندے کو اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اسی طرح علم کی بھی ایک لذت ہے جب وہ علم کی لذت بندے کو نصیب ہو جائے تو پھر بندے کے لیے مجاہدہ برداشت کرنا کوئی مجاہدہ نہیں رہا کرتا۔

اور یہ رنگ چڑھتا ہے جب انسان کے دل میں خشیت ہوتی ہے۔

ان کے ایک دوست تھے قاسم ابن احمد وہ کہا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ میں کون سی ایسی خاص چیز ہے کہ لوگوں کا ان کی طرف بڑا رجوع ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے تسخیرِ قلوب کا مقام عطا کر دیا، جدھر جاتے تھے لوگوں کے دل مسخر ہو جاتے تھے۔ ان کی مجلس میں لوگ مور و ملخ کی طرح علم حاصل کرنے کے لیے کھچے چلے آتے تھے۔ ہم بھی حدیث پڑھتے ہیں، یہ بھی حدیث پڑھتے

ہیں، جتنی عبادت یہ کرتے ہیں، اتنی عبادت ہم بھی کرتے ہیں، کون سی خاص چیز ہے مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔

فرمانے لگے ایک مرتبہ ہم بیٹھے اچانک ہوا کا جھونکا آیا اور چراغ بجھ گیا، اندھیرا ہو گیا۔ ایک آدمی چراغ جلانے کے لیے اٹھا۔ جب اس نے دوبارا چراغ جلایا تو نظر عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ آنسوؤں سے ان کی ریش تر ہو چکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ عبداللہ کیوں روئے؟ کہنے لگے کہ مجھے اس اندھیرے کو دیکھ کر قبر کا اندھیرا یاد آ گیا۔ تب مجھے بات سمجھ میں آئی کہ اس خوفِ خدا کی صفت کی وجہ سے اللہ نے ان کو لوگوں کا مرجع بنا دیا۔ اور جب دل میں خوفِ خدا ہو اور انسان گناہوں سے بچے پھر اللہ رب العزت اس کو لوگوں میں مقبول بنا دیا کرتے ہیں۔

خوفِ خدا کا یہ عالم تھا، ایک مرتبہ شام کے سفر پر گئے اور لکھنے کے لیے کسی سے قلم لیا، اب قدرتاً وہ قلم ان کے پاس رہ گیا۔ جب یہ واپس اپنے وطن پہنچے تو خیال آیا کہ اوہو یہ قلم تو میں نے کسی سے مانگا تھا اور میرے ساتھ ہی آ گیا، اس کی تو مجھے ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کئی سو میل کا سفر صرف اس لیے کیا کہ واپس جا کر اس بندے کو اس کا قلم واپس کر سکوں۔

آپ سوچیں کہ آج ہمارا عمل اس کے مطابق ہے۔ طلبا جہاں رہتے ہیں بغیر اجازت ایک دوسرے کی چیزوں کو استعمال کرنا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ کسی سے کوئی چیز لیتے ہیں تو دینے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بلکہ طلبا میں لطیفہ مشہور ہے کہ وہ شخص بڑا بے وقوف ہے جو دوسرے کو پڑھنے کے لیے اپنی کتاب دے دے اور اس سے بڑا بے وقوف وہ ہے جو کتاب لے کے اس کو واپس کر دے۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے سینکڑوں میل کا سفر ایک قلم واپس کرنے کے لیے کیا۔ اور اس زمانے میں اونٹوں پر

سفر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں بیس میل سے زیادہ سفر کر ہی نہیں سکتے تھے کتنا وقت لگا ہو گا؟ کتنی مشقت اٹھائی ہو گی؟ مگر قلم کو واپس کیا، تب اپنے ملک واپس آئے۔

خوفِ خدا کی علامت:

چنانچہ فرمایا کرتے تھے جس شخص میں خوف خدا ہو اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ گناہوں سے بچے گا۔ یہ نہیں کہ زبان سے کہے کہ جی میں تو بڑا اللہ سے ڈرتا ہوں، بڑا میرے دل میں اللہ کا خوف ہے اور انسان گناہوں میں منہ مارتا پھرے۔ گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا یہ خوفِ خدا دل میں ہونے کی پکی دلیل ہوا کرتی ہے۔ اور جو شخص گناہ پر قدرت رکھتا ہو اور پھر اس گناہ سے بچ جائے تو حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے عرش کا سایہ عطا فرمائیں گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خوف خدا:

اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو دیکھیں تو آپ کو یہی چیز خاص نظر آئے گی۔ ''اللہ کا خوف''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں رات کو گشت پر نکلے کہ دیکھیں لوگ کس حال میں ہیں۔ ایک گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے سنا کہ ایک بوڑھی عورت ایک بچی کو کہہ رہی ہے، کیا بکری نے دودھ دے دیا؟ اس نے جواب دیا کہ دیا لیکن تھوڑا دیا ہے۔ کہا کہ دودھ لینے والے آئیں گے، اس میں تھوڑا سا پانی ملا دو تا کہ مقدار پوری ہو جائے۔ اس نے کہا کہ میں تو پانی نہیں ملاؤں گی، امیر المؤمنین نے منع کیا ہے۔ تو بوڑھی عورت نے کہا: کون سا امیر المؤمنین دیکھ رہے ہیں؟ تو جواب میں اس لڑکی نے کہا: اگر امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہے لیکن امیر المؤمنین کا پروردگار تو دیکھ رہا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی اور واپس آ گئے۔ صبح اٹھے، اس بوڑھی عورت اور اس

لڑکی کو بلوایا تو پتہ چلا کہ لڑکی جوان العمر ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے لیے اس جوان العمر لڑکی کا رشتہ طلب کیا اور اپنے بیٹے سے اس کا نکاح کر دیا۔ تو پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کی نظر بھی ہمیشہ اس بات پر رہتی تھی کہ کس کے دل میں کتنا اللہ کا خوف ہے۔

چنانچہ عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ہے کہ سفر میں ایک جگہ پڑاوڈالا تو ایک چرواہا گزرا۔ اس کو بلا کر کہا کہ ایک بکری دے دو، پیسے لے لو۔ ہم پکائیں گے اس کا گوشت ہم بھی کھائیں گے، آپ بھی کھانا۔ اس نے کہا: جی بکریاں تو میری نہیں ہیں۔ اس کو آزمانے کے لیے کہا کہ مالک کو کہہ دینا کہ ایک بکری کو بھیڑیا کھا گیا۔ تو چرواہے نے آگے سے کہا کہ فَاَیْنَ اللّٰہ "تو پھر اللہ کہاں ہے"۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس واقعے کو بیان کیا کرتے تھے۔ سوچیں کہ جس زمانے میں ویرانے کے اندر بکریاں چرانے والے کے دل کے اندر ایسا اللہ کا خوف تھا کہ وہ کوئی بددیانتی سے گریز کرتا تھا اور اگر کوئی کرنے کو کہتا تو اس کو جواب دیتا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس دور میں سوچیں ایمان کی لوگوں کے دلوں میں کیا حلاوت ہوگی؟ آج تو مصلوں پہ بیٹھے ہوئے ہمارے دلوں کے اندر اتنا خوف نہیں ہوتا۔ ہم اللہ رب العزت سے جہاں اور بہت ساری دعائیں مانگتے ہیں یہ دعا بھی ہم اللہ سے مانگیں کہ اے اللہ! ہمیں ایسا خوف عطا کر دیجیے کہ ہمارے لیے گناہوں سے بچنا آسان ہو جائے۔ فرمایا:

((رَاْسُ الْحِکْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ)) (شعب الایمان، رقم ۷۴۴)

"حکمت کی اصل اللہ تعالیٰ کا خوف ہے"

ایسا نہ ہو کہ ظاہر میں ہم اللہ کے دوست بنیں اور تنہائیوں میں ہم اللہ کے دشمن بن کر زندگی گزارتے پھریں۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں مماثلت:

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اللہ کا خوف بہت زیادہ تھا۔ اس خوفِ خدا

کی یہ حالت تھی کہ جب عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت قریب آیا، شاگرد پاس تھے، شاگردوں سے فرمایا کہ مجھے چار پائی سے اٹھا کے نیچے زمین پر لٹا دو! پہلے تو شاگرد تھوڑا حیران ہوئے نیچے قالین تو نہیں بچھے ہوئے تھے، مٹی تھی۔ دوبارہ کہا: چار پائی سے اٹھا کر زمین پر لٹا دو! شاگردوں نے اس پر عمل کیا۔ جیسے ہی زمین پر لٹایا گیا تو کہتے ہیں عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اپنے رخسار کو زمین پر رگڑنے لگے اور اپنی داڑھی کو پکڑ کر روتے ہوئے کہنے لگے: اللہ! عبداللہ کے بڑھاپے پر رحم فرما۔ یہ نہیں کہا: میں نے چالیس چالیس ہزار طلبا کو حدیث پڑھائی، میری وجہ سے اتنے لوگ نیکی پر آئے، اللہ! میرے سے ایک بندے نے حدیث کا سوال پوچھا تھا اور حدیث پر گفتگو کرتے کرتے اسی میں فجر کی اذان ہو گئی تھی، کوئی عمل اپنا اللہ کے سامنے پیش نہیں کیا۔ جانتے تھے ہمارے عمل اللہ کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں۔ صرف رو کر اتنی بات کہی: اللہ! عبداللہ کے بڑھاپے پر رحم فرما۔

سلمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے محدث ہیں۔ فرماتے ہیں میں نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو کئی سال قریب سے دیکھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک فرق تھا کہ صحابہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیدار کیا تھا جب کہ ان کو یہ سعادت نہیں ملی تھی۔ ان کے سوا مجھے ان کی زندگی میں اور صحابہ کی زندگی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ جس بندے کی زندگی ایسی ہو وہ اپنے آخری وقت میں اللہ کے سامنے رو کر دعا کر رہا ہے: اللہ! عبداللہ کے بڑھاپے پر رحم فرما۔ اللہ کی عظمتوں کو جانتے تھے۔ عزیز طلبا! آج ہم اللہ رب العزت سے ایسا خوف مانگیں جو ہمیں گناہوں سے بچائے اور نیکی تقویٰ کی زندگی عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا﴾ (الکہف:۱۱۰)

حسنِ خاتمہ کے اسباب

بیان: محبوب العلماوالصلحا، زبدۃ السالکین سراج العارفین حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 21 ستمبر 2007ء مطابق رمضان ۱۴۲۸ھ

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

موقع: خطبہ جمعۃ المبارک

اقتباس

انجام کو دیکھا جاتا ہے، جب انسان کا انجام اچھا ہو تو ساری زندگی اچھی ہو گئی۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے یہی مضمون خود ارشاد فرمایا: چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے:

((كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ))

''تم جس حال میں زندگی گزارو گے تمہیں اسی حال میں موت آئے گی''

تو گویا اصول یہ بنا کہ جس کی زندگی محمود اس کی موت بھی محمود اور جس کی زندگی مذموم اس کی موت بھی مذموم۔ تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس سمت پر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری زندگی گزارنے کا انداز کیا ہے؟ صالحین والا ہے یا فاسقین والا ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

حسنِ خاتمہ کے اسباب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا﴾ (الکہف:۱۱۰)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

انجام اچھا سب اچھا:

''جو شخص اللہ سے ملاقات کی دل میں تمنا رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے''

یعنی اپنے دل کو کسی غیر کے ساتھ ملوث نہ کرے۔ رمضان المبارک کا مہینہ اللہ کی رحمتوں کا خزینہ ہے۔ جہاں انسان بہت ساری دعائیں مانگتا ہے، ایک دعا بڑی اہم ہے جو ہمیں اس مہینے میں مانگنی ہے اور اللہ سے منوانی ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی زندگی گزارنے کی توفیق دے کہ آخری لمحے میں ہمیں کلمہ نصیب ہو جائے۔ انگریزی میں کہتے ہیں۔

All is well thats end is well

جب کسی چیز کا انجام اچھا ہو تو سب چیز اچھی ہوتی ہے۔

انجام کو دیکھا جاتا ہے، جب انسان کا انجام اچھا ہو تو ساری زندگی اچھی ہو گئی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی مضمون خود ارشاد فرمایا: چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے:

((کَمَا تَعِیْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ))

''تم جس حال میں زندگی گزارو گے تمہیں اسی حال میں موت آئے گی''

تو گویا اصول یہ بنا کہ جس کی زندگی محمود اس کی موت بھی محمود اور جس کی زندگی مذموم اس کی موت بھی مذموم۔ تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس سمت پر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری زندگی گزارنے کا انداز کیا ہے؟ صالحین والا ہے یا فاسقین والا ہے۔

شریعت سے پھسلنا پل صراط سے پھسلنا ہے:

چنانچہ ہمارے مشائخ نے لکھا ہے کہ جو شخص دنیا میں جتنی استقامت کے ساتھ شریعت کے اوپر چلے گا، اتنا ہی قیامت کے دن پلصراط پر وہ آسانی کے ساتھ چل سکے گا۔ اگر دنیا میں احکامِ شریعت پر عمل کرنے میں پھسلتا ہو گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پل صراط پر بھی پھسلے گا۔ اب فیصلہ ہم خود کر سکتے ہیں۔ کیا ایسا ہوتا ہے کہ حکمِ خدا سامنے آیا اور اپنی شہوت کی وجہ سے، غصے کی وجہ سے، نفس کی خرابی کی وجہ سے ہم پھسل گئے، شریعت کو نظر انداز کر دیا۔ تو اگر دنیا میں احکامِ شریعت پر عمل کرنے میں پھسلتے رہیں گے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ کل پل صراط پر چلتے ہوئے بھی پھسل جائیں گے۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس دن نہ پھسلیں اور پل صراط سے آرام کے ساتھ گزر جائیں تو پھر اس دنیا کے اندر ہمیں احکام شریعت کے اوپر استقامت کے ساتھ چلنا ہو گا۔ جیسے بھی حالات ہوں، نفس کی مخالفت کرنی پڑے یا لوگوں کی مخالفت مول لینی پڑے، ہم شریعت وسنت کے راستے پر ڈٹے رہنا ہو گا۔

خاتمہ بالخیر کے لیے دس اعمال

مشائخ نے دس ایسی باتیں بتائی ہیں کہ جن کی فکر کی جائے تو انسان کو آخری وقت میں کلمہ نصیب ہوتا ہے، اس کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے۔ اب یہ بہت اہم باتیں ہیں، اسی لیے خاص آج رمضان المبارک کے جمعہ میں اس مضمون کو بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تاکہ اس کے بارے میں ہم سب فکرمند ہوں۔

پہلا عمل......نگاہ کی حفاظت

سب سے پہلی چیز جو خاتمہ بالخیر کے بارے میں معاون ثابت ہوتی ہے، وہ ہے نگاہ کی حفاظت۔ نظر کی بد پرہیزی انسان کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے انسان آخری وقت میں کلمہ بھول جاتا ہے، اس کو چھوٹا گناہ نہ سمجھیں۔ یہ جو ہوتا ہے ناحسرت کے ساتھ کسی غیر کی طرف نظر اٹھنا کہ ہائے یہ بھی مجھے مل جائے، یہ بھی میرے پاس آجائے، دل کی شہوت کے ساتھ جب انسان کسی پر محبت کی نظر ڈالتا ہے تو اس کے بدلے میں اللہ کی محبت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

محبت میں غیرت ہوتی ہے:

آپ خود سوچیں! بیوی فاقہ برداشت کر لیتی ہے، پھٹے پرانے کپڑے پہن کے گزارا کر لیتی ہے، روکھی سوکھی کھا لیتی ہے لیکن اگر اس کا خاوند کسی غیر عورت کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھے، کبھی برداشت نہیں کرتی۔ تو بیوی اگر نظر برداشت نہیں کرتی تو اللہ رب العزت بھی تو محبت کی نگاہ چاہتے ہیں وہ کیسے برداشت فرمائیں گے کہ بندہ میرا ہو اور دل میں غیر کی بسائے پھر رہا ہو۔

بیوی اگر خاوند کو غیر کی طرف نظر ڈالتا دیکھے تو بولنا چھوڑ دیتی ہے، ناراض ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس چھوٹے سے عمل کی وجہ سے بندے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ محبت کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ چونکہ محبت میں غیرت ہوتی ہے، اس لیے اس کی وجہ سے بیوی گھر چھوڑ کے چلی جاتی ہے کہ غیر کی طرف دیکھتا کیوں ہے؟ اور کہتی بھی ہے کہ میں تیری ساری غلطیاں میں برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ تو غیر کی طرف دیکھے۔

توحید دھوبن نے سکھائی:

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہمیں توحید ایک دھوبن نے سکھائی۔ کسی نے کہا: حضرت وہ کیسے؟ فرمایا کہ ہمسائے میں دھوبی رہتا تھا میں رات میں گرمی کے موسم میں چھت پر سویا ہوا تھا۔ مجھے ہمسائے میں میاں بیوی میں کچھ تلخ کلامی تو تکار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ذرا غور کیا تو بیوی شوہر سے کہہ رہی تھی کہ میں نے تمہاری وجہ سے اس گھر کے اندر بھوک کو برداشت کیا، پیاس کو برداشت کیا، تنگی ترشی ہر چیز کو برداشت کیا اور میں تمہاری خاطر اور بھی بہت کچھ تنگی برداشت کر سکتی ہوں لیکن اگر تم چاہو کہ میرے سوا کسی غیر کی طرف نظر اٹھاؤ، میں یہ نہیں برداشت کر سکتی۔ فرماتے ہیں کہ میں قرآن پاک میں نظر دوڑائی تو میری نظر اس آیت پر آ کر رک گئی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النسآء:۱۱۵)

میرے بندے جو بھی گناہ لے کر آؤ گے میں سب معاف کر دوں گا لیکن میری محبت میں کسی کو شریک کرو گے یہ گناہ میں معاف نہیں کروں گا۔

نگاہوں کی حفاظت اور حلاوتِ ایمان:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((اَلنَّظْرُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ))

''کہ نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے''

((مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِي اَبْدَلْتُهُ اِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِي قَلْبِهِ))

''جس نے اس کو میرے خوف کی وجہ سے چھوڑ دیا، اس نظر کو روکنے کی بدلے میں اس کو ایسا ایمان دوں گا کہ وہ اپنے دل میں اس ایمان کی حلاوت کو محسوس کرے گا۔''

تو غیر سے نظر بچانے کے بدلے میں اتنا بڑا انعام ملا کہ بندے کو حلاوتِ ایمان نصیب ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ پھر اس کی تشریح فرماتے ہیں:

قَدْ وَرَدَ اَنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًا لَا تَخْرُجُ مِنْهُ اَبَدًا

''یہ بات وارد ہوئی ہے کہ جب دل کے اندر حلاوتِ ایمان داخل ہوتی ہے تو وہ دل سے کبھی باہر نہیں نکلتی''

تو جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں حلاوتِ ایمان پیدا کر دوں گا تو اس کا مطلب یہ کہ اب اس بندے کا موت تک ایمان محفوظ رہے گا۔

بتوں کو توڑ تخیل کے ہوں یا پتھر کے:

تو آج کی اس مبارک مجلس میں اس بات کا ہم عہد کریں کہ

((تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعًا كَذَالِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ))

(الملل والنحل: جز۲، ص۲۴۴)

''اللہ میں نے سب لات ومنات چھوڑ دیے، ایک عقل مند آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے''

کسی بندے سے نفسانی محبت کرنا، کسی بندی سے محبت کرنا، سب لات ومنات ہیں۔تو دل میں یہ عہد کریں کہ اے اللہ! ایک تیری رضا کے لیے میں نے سب کو چھوڑ دیا۔

بتوں کو توڑ تخیل کے ہوں یا پتھر کے

یہ نہیں ہوتا کہ فقط پتھر کے بت بنے ہوتے ہیں، تخیل کے بھی بت ہوتے ہیں۔ نوجوان خیالی محبوب بنا لیتے ہیں، خیالات کی دنیا میں اس سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، باتیں ہوتی ہیں، ان کی محبت دل پر چھائی ہوتی ہے۔تو آفاقی اور انفسی معبودوں کو چھوڑ کر ایک اللہ سے اپنے رشتے کو جوڑنا چاہیے۔

کیجیے اس واسطے گم گشتہ جنت کی تلاش
کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں، چھ فٹ کا کھلونا ہے، پوری زندگی اسی کی خاطر گزر رہی ہے۔نفس ایسا خبیث ہے، وہ کہتا ہے: بالکل چھوڑ دو، مگر کہیں کہیں تو دیکھ بھی لو! تو یہ بھی نہیں کرنا...... مکمل پرہیز...... دل میں یہ عہد ہو کہ اے اللہ! آج کے بعد میں نے غیر محرم کی طرف نظر نہیں اٹھانی۔اب اگر بہانہ کرے کہ تم بچ ہی نہیں سکتے ......ہم نہیں بچ سکتے تو ہمارا پروردگار تو ہمیں بچا سکتا ہے۔ اللہ پر کیوں نہ نظر دوڑائیں؟ وہ پروردگارِ رحمت فرمائے گا اور یہ مشکل کام ہمارے لیے آسان فرما دے گا۔

حلاوتِ ایمان کا مزہ:

حلاوتِ ایمان جب بندے کو ملتی ہے نا تو اس کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے،

شہوتوں کے مزے تھوڑے اور حلاوتِ ایمان کا مزہ ان سب سے زیادہ اعلیٰ ہوتا ہے۔آپ خود سوچیے کہ جسم کے اعضا سے جو مزے ملتے ہیں وہ اگر ایسے ہیں تو دل جو تمام اعضا کا سردار ہے اس سے جو مزے ملتے ہوں گے وہ کیسے ہوں گے؟ اور حلاوتِ ایمان کا مزہ دل سے ملتا ہے۔ بدن گدگدائیں تو کتنا مزہ آتا ہے، اگر دل کو گدگدائیں تو پھر کتنا مزہ آئے گا؟ اللہ والے بندوں کے دلوں کو گدگدا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت کا مزہ ہی جدا ہے۔

حلاوتِ ایمان کی علامات:

چنانچہ علما نے حلاوتِ ایمان کی پانچ نشانیاں لکھی ہیں ہم بھی اس سے چیک کر سکتے ہیں کہ ہمیں ایمان کی وہ حلاوت مل رہی ہے یا نہیں مل رہی۔

پہلی علامت......عبادت میں مزہ:

سب سے پہلے فرمایا:

اِسْتِلْذَاذُ الطَّاعَةِ

حلاوۃِ ایمان کی پہلی نشانی کہ عبادات میں مزہ آتا ہے۔نماز میں مزہ، تلاوت میں مزہ، ذکر میں مزہ، سچ بولنے میں مزہ، نیکی کے کام کرنے میں مزہ، اللہ کی اطاعت کرنے میں بندے کو مزہ آتا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لذت کی وجہ سے یہ کام کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ عبد الطف بن جاتا ہے۔ہوتا وہ عبد اللطیف ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو عبادات کے اندر ایک سکون دے دیتے ہیں۔

چنانچہ حدیث مبارک میں آتا ہے

((اَلْمُؤْمِنُ فِي الْمَسْجِدِ كَالسَّمَكِ فِي الْمَآءِ))

''مومن مسجد میں ایسے ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں''

جیسے مچھلی پانی میں آکر پرسکون ہو جاتی ہے، بچہ ماں کی گود میں آکر پرسکون ہو جاتا ہے، ایسے ہی بندہ اللہ رب العزت کے گھر میں آکر پرسکون ہو جاتا ہے۔

دوسری علامت......شہوات کو چھوڑنا آسان:

اِیْثَارُھَا عَلٰی جَمِیْعِ الشَّھْوَاتِ

یہ ایسی لذت ہوتی ہے کہ تمام شہوات کا چھوڑ دینا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال سن لیں۔ایک جوان العمر شادی شدہ آدمی کو اگر کہیں کہ بھئی! ہم آپ کو ایک ڈبہ بسکٹ کا دے دیں گے، آج آپ گھر بیوی کے پاس نہ جائیں۔ وہ مسکرائے گا کہ کیا بیوقوفی کی بات ہے، ایک ڈبہ بسکٹ کی کوئی ہے نسبت اس کے ساتھ۔تو جس طرح اس لذت کو اس لذت کے ساتھ نسبت ہی نہیں، ایسے ہی دنیا کی شہوتوں کو اللہ رب العزت کی محبت کی لذت کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔

تیسری علامت......مشقت اٹھانا آسان:

تحمل مُشَقَّةً فِیْ مَرْضَاةِ اللّٰہِ

اللہ کی رضا کے لیے وہ انسان پھر مشقتیں اٹھاتا ہے۔اس کو مشقتیں مشقت نظر نہیں آتیں۔ ساری رات جاگنا آسان، اپنے بدن کو اللہ کی عبادت میں تھکا دینا آسان، روزے رکھنا آسان، زکوٰۃ ادا کرنا آسان۔اللہ کے دین کیلیے مشقت اٹھانی اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔کسی عاشق نے کہا تھا ؎

اللہ تیرا غم بھی مجھ کو عزیز ہے
کہ وہ تیری دی ہوئی چیز ہے

اللہ رب العزت کی طرف سے اگر اس کو مشقتیں بھی ملتی ہیں تو وہ محبوب کا دیا ہوا

ہدیہ سمجھ کر اس کو قبول کر لیتا ہے۔

چوتھی علامت...... مصیبت میں راحت:

تَجْرِءُ الْمَرَارَاتِ فِی الْمُصِیْبَاتِ

مصیبتیں آتی ہیں تو مصیبتوں کے گھونٹ وہ اس طرح بھرتا ہے جس طرح لوگ شربت کے گھونٹ بھرا کرتے ہیں۔

ایک بزرگ تھے ان پر فاقہ آیا۔ رو رہے تھے، اللہ سے دعا مانگ رہے تھے، شکر ادا کر رہے تھے۔ کسی نے کہا: یہ بھی کوئی شکر ادا کرنے والی بات ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اللہ یہ نعمت تو اپنے پیاروں پر بھیجا کرتے ہیں میری کون سی بات ان کو پسند آ گئی کہ انہوں نے مجھے بھی یہ نعمت عطا فرما دی۔ چنانچہ اللہ رب العزت کی طرف سے اگر اس پر مشکل حالات آ جائیں تو وہ اس کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ وہ اس کو اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے۔

پانچویں علامت...... رضا بالقضاء:

اَلرِّضَاءُ بِالْقَضَاءِ فِیْ جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ

زندگی کے تمام حالات میں وہ اللہ کی قضا کے اوپر راضی رہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھ، لوحِ محفوظ پر قلم نے لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے لکھا:

اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلِیْ

کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول ہیں۔

اور اس کے بعد اگلی بات یہ لکھی:

مَنْ لَّمْ یُسَلِّمْ بِقَضَائِیْ

جو میری قضاء کو تسلیم نہیں کرتا

وَلَمْ يَصْبِرْ عَلىٰ بَلَائِي

میری بھیجی ہوئی بلاؤں پر صبر نہیں کرتا

وَلَمْ يَشْكُرْ عَلىٰ نِعْمَائِي

میری دی ہوئی نعمتوں کا شکرادا نہیں کرتا

فَالْيَتَّخِذْ رَبًّا سِوَائِي (البحر المدید: ۳/۳۴)

اس کو چاہیے کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا رب بنالے۔

تو مؤمن اللہ رب العزت کی طرف سے جو حالات ہوں بس ان کے اوپر راضی اور خوش رہتا ہے ؎

نہ تو ہجر ہے اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

دوسرا عمل...... مسواک کی پابندی

دوسرا عمل مسواک باقاعدگی سے کرنا۔ مسنون طریقہ یہی ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے، تین انگلیاں اوپر چھنگلی نیچے اور یہ انگوٹھا سائیڈ پر، یہ مسواک کو پکڑنے کا مسنون طریقہ ہے، اس کو پکڑ کر مسواک کرے اور باقاعدگی کے ساتھ کرے، نماز کا ثواب بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس عمل کو پسند کرتے ہیں، نبی علیہ السلام نے فرمایا:
اگر مجھے مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو میں وضو کے ساتھ مسواک کا کرنا لازم قرار دیتا۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو مسواک کا اہتمام کرتا ہے جب آخری وقت آتا ہے تو ملک الموت اس کے پاس آتے ہیں اور ملک الموت شیطان کو اس بندے سے دور بھگا دیتے ہیں اور اس بندے کو کلمہ یاد دلا دیتے ہیں۔

کتنا بڑا انعام ہے! اس مسواک کی سنت پر پابندی سے کہ ملک الموت آتے ہیں اور شیطان کو اس سے دور بھگا دیتے ہیں اور اس بندے کو موت کے وقت کلمہ یاد دلا دیتے ہیں کہ بھئی میں آ گیا ہوں تو کلمہ کی توفیق مل جاتی ہے۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں مسواک کے بارے میں۔

مِنْ مَنَافِعِهٖ تَذْكِيْرُ الشَّهَادَةِ عِنْدَ الْمَوْتِ

اس کے فوائد میں سے ہے کہ موت کے وقت بندے کو کلمۂ شہادت بندے کو یاد آ جاتا ہے۔

رَزَقَنَا اللّٰهُ تَعَالٰی بِمَنِّهٖ وَ كَرَمِهٖ

تیسرا عمل...... شکر ادا کرنا

تیسرا عمل سے جس سے آخری وقت میں انسان کو کلمہ نصیب ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے ایمان پر اللہ کے حضور شکر ادا کرے۔ چونکہ اللہ رب العزت کا یہ فیصلہ ہے۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراھیم:۷)

''کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں اپنی نعمتیں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا''

تو اللہ رب العزت نے جو ایمان والی نعمت عطا کی ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ میرے مولا تیرا کتنا بڑا کرم ہے تو نے ایمان کی توفیق عطا فرما دی۔ جب ہم شکر ادا کریں گے تو اللہ رب العزت اس میں اور اضافہ فرمائے گا۔ ایک بزرگ تھے، ان پر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں تھیں اور وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے سارے عملوں کا بدلہ دنیا میں مل جائے اور آخرت میں کہہ دیا جائے:

﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾

(الاحقاف:۲۰)

تو وہ کہتے تھے کہ بس مجھے دنیا میں یہ سب آسائشیں نہیں چاہئیں آخرت میں چاہئیں۔ بدلہ آخرت میں چاہیے تو جتنی اور نعمتیں ہوتی ہیں اتنا ڈرتے اور روتے۔ ایک دفعہ ان کے دل پہ عجیب کیفیت ہوئی۔ کہنے لگے: یا اللہ! میں بار بار آپ کو فریاد کرتا ہوں کہ میرے مولا مجھے اور نعمتیں نہیں چاہیے آپ نعمتیں دیے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے دل میں الہام فرمایا: میرے پیارے! میرے ہاں دستور ہے جو بندہ نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے، میں نعمتیں بڑھاتا ہوں تو جب تک نعمت کا شکر ادا کرنا بند نہیں کرے گا میں تمہیں نعمتیں عطا کرنا کبھی بند کر نہیں سکتا۔

تو بھئی! اللہ نے ہمیں ایمان کی نعمت عطا فرمائی کتنا بڑا اللہ کا کرم ہے، اس پر شکر ادا کریں۔ شکر ادا کرنے کا ایک بہترین طریقہ نبی علیہ السلام نے دعا سکھائی۔ قربان جائیں محبوب دو عالم ﷺ پر، کیا احسانات ہیں ان کے امت کے اوپر فرمایا صبح شام یہ دعا مانگو:

((رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا))

میں اللہ سے راضی کہ وہ میرا رب ہے

((وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا))

اور میں محمد ﷺ سے راضی کہ میرے نبی ہیں۔

((وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا)) (ابی داؤد:۲۰۷۱)

اور میں اسلام سے راضی کہ وہ میرا دین ہے

ہم خوشی کا اظہار اس پر کریں گے اور اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ اللہ اور نعمت عطا فرمائیں گے۔

چوتھا عمل......صدقہ

چوتھا عمل کہ جس سے کہ آخری وقت میں انسان کو کلمہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اللہ کے راستے میں صدقہ وخیرات کرنا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان آتا تھا تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں تین بڑی واضح تبدیلیاں دیکھتی تھی۔

پہلی تبدیلی نبی علیہ السلام عبادت میں بہت زیادہ مشقت اٹھاتے تھے۔ پہلے بھی عبادت کرتے تھے لیکن رمضان آنے پر بہت زیادہ کھپا دیتے تھے اپنے آپ کو۔

اور دوسرا فرماتی ہیں کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتے تھے۔

تیسرا فرماتی ہیں کہ دعاؤں کے اندر بہت عاجزی اور لجاجت فرمایا کرتے تھے ہم بھی یہ تینوں عمل کریں رمضان المبارک میں۔

حدیث مبارکہ ہے مشکوٰۃ شریف کی روایت ہے، صدقہ کے بارے میں:

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ عَنْ مِيْتَةِ السُّوْءِ

(الترمذی، رقم:۶۰۰)

صدقہ اللہ رب العزت کی ناراضگی کو بجھا دیتا ہے۔ ختم کر دیتا ہے اور بری موت سے بندے کو بچا لیتا ہے۔ بھئی صدقہ مصیبت سے بچاتا ہے تو سب سے بڑی مصیبت تو بری موت ہے۔

اکابر کا عمل:

اسی لیے ہمارے اکابر اپنے بچوں کے ہاتھوں سے فقرا کو صدقہ دلواتے تھے۔

بچوں کو جب کچھ خرچ کے لیے دیتے تھے تو ان کو سمجھاتے تھے کہ تم اس کو جمع کرو اور جب جمعہ کا دن آئے تو تم اس کو مسکینوں کو دو، مساجد میں دو، اللہ کے راستے میں خرچ کرو، تو بچوں کو صدقہ دینے کی باقاعدہ تربیت دیا کرتے تھے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ ایک لاکھ دیں یا ایک روپیہ دیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

It is not the thing which count

چیز کو نہیں دیکھتے بندے کی نیت کو دیکھتے ہیں۔

اسی لیے ایک بزرگ تھے، ایک دفعہ ان کو کھانے میں آلو ملے۔ بڑا اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ سڑے ہوئے آلو ملے ہیں، اس پر بڑا شکر ادا کر رہے ہو۔ کہنے لگے: میں یہ نہیں دیکھ رہا کہ مجھے کھانے میں آلو ملے میں اس چیز کو دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جب رزق کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنے اس بندے کو بھی یاد رکھا۔ یہ تھوڑی بات ہے کہ مجھے اللہ نے یاد رکھا، مجھے ملا تو سہی نا اللہ کی طرف سے۔ سبزی ملی تو کیا ہوا؟ تھوڑا ہو یا زیادہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔

لِيُنفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (الطلاق:۷)

’’کہ خرچ کرے استطاعت والا اپنی استطاعت کے مطابق‘‘

کئی مرتبہ ایک غریب آدمی کا مٹھی بھر جو اللہ کے راستے میں خرچ کر دینا اس کے لیے جہنم سے نجات کا سبب بن جایا کرتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ صدقہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

تَمْنَعُ اِنْزَالَ الْمَكْرُوْهِ وَالْبَلَاءِ فِي الْحَالِ

صدقہ سے جو بلائیں اور ناپسندیدہ حالات آتے ہیں، اللہ ان کو بھی روک دیتے ہیں۔

وَتَدْفَعُ السُّوْءَ الْخَاتِمَةَ فِي الْمَالِ (شرح جامع الصغیر:۲/۴۶)

اور آنے والے وقت میں اللہ موت کے وقت ان کو برے خاتمے سے بچا لیتا ہے۔

پانچواں عمل...... صحبتِ اہل اللہ

پانچواں عمل جس سے کہ آخری وقت میں انسان کو کلمہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (توبہ:۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو! اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ!

نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو تو اس صحبت سے بندے کو آخری وقت میں کلمہ نصیب ہو جاتا ہے۔

لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی گارنٹی:

حضرت محمد مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شعر پڑھا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا ۔

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر است صد سالہ طاعت بے ریا

اللہ والوں کی ایک لمحہ کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بھی بہتر ہے۔

تو فرمانے لگے کہ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا کہ شاعر لوگ اکثر باتوں میں افراط و تفریط کر جاتے ہیں۔ شاعرانہ مزاج ہی ایسا ہوتا ہے۔ تو لگتا ہے کہ اس میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ جذبات کی رو میں بہہ گئے کہہ دیا کہ اللہ والوں کی ایک لمحہ کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بھی بہتر ہے۔ نکتہ جو نظر آ رہا

ہے وہ یہ کہ اگر کہہ دیتے کہ سو سال کی عبادت سے بہتر ہے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن یہاں تو کہا کہ سو سال کی ''بے ریا'' عبادت سے بہتر ہے۔ یہاں آ کر مسئلہ پھنس گیا۔ چنانچہ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے۔ اپنے شیخ کے پاس فرمانے لگے کہ حضرت! مجھے لگتا ہے کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ حضرت فرمانے لگے کہ یہ شعر میں پڑھوں، فرمانے لگے کہ پڑھیں۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شعر پڑھا۔

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر است لکھ سالہ طاعت بے ریا

کہنے لگے: حضرت سو سال سمجھ نہیں آ رہے تھے آپ نے لاکھ سال پڑھ دیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بات سمجھائی کہ اچھا یہ بتاؤ! اگر بندہ ایک سال تک بے ریا عبادت کرے تو اس کو اپنے اچھے خاتمے کا یقین ہو سکتا ہے۔ گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا۔ شیطان کی مثال سامنے ہے، لاکھوں سال اس نے عبادت کی، انجام برا ہوا۔ قرآن مجید میں تذکرہ ہے، بلعم باعور نے تین سو سال عبادت کی انجام برا ہو۔ تو اتنی عبادتوں کے باوجود انجام کے بارے میں گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا۔ فرمایا: اس کا مطلب یہ ہوا کہ لاکھ سال کی عبادت کے بعد بھی تو گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا۔ فرمایا: اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے سے اللہ کے حبیب نے گارنٹی دے دی۔ حضرت وہ کیسے؟ فرمایا: حدیث پاک میں نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ والوں کے پاس اگر تم بیٹھو گے:

((اَلْجُلَسَآءُ هُمْ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ))(ابن حبان: ۱۳۹/۳)

یہ وہ بندے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا

فرمایا: بد بخت وہ ہوتا ہے جس کا انجام برا ہو، جس کا انجام اچھا ہو وہ بد بخت نہیں

ہو سکتا۔ تو گویا لسانِ نبوت سے خوشخبری مل رہی ہے کہ ایک لمحے میں وہ نعمت مل سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انجام اچھا فرما دے۔ اس لیے اللہ کے لیے محبت کرنا قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہونے کا ذریعہ ہے۔ حدیثِ پاک میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ دو شخص اللہ کی رضا کے لیے دین کی نسبت سے ایک دوسرے سے محبت کریں گے

هُمْ مُتَحَابُّوْنَ فِيْ اللّٰهِ وہ اللہ کے لیے محبت کریں گے

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے۔

چھٹا عمل......اللہ تعالیٰ سے اظہارِ محبت

چھٹا عمل جس کی وجہ سے آخری وقت میں کلمہ حاصل ہونے میں آسانی نصیب ہو سکتی ہے، وہ ہے اللہ رب العزت سے محبت کا اظہار کرنا۔

اللہ سے محبت کا اظہار کرنا کیوں؟ اس لیے کہ جو شخص دنیا میں اللہ سے محبت کی کوشش کرے گا، اللہ تعالیٰ سے دوستی لگانے کی کوشش کرے گا، قیامت کے دن اللہ کے دشمنوں کی قطار میں کبھی کھڑا نہیں کیا جائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ اللہ کی محبت کے لیے کوششیں کر رہا ہو، عمل کر رہا ہو، زندگی گذار رہا ہو اور اللہ اس کو قیامت کے دن اپنے دشمنوں کی قطار میں کھڑا کر دے گا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پوری زندگی میں ایک مرتبہ اگر کسی کی زبان سے محبت کے ساتھ اللہ کا لفظ نکلا، یہ لفظ کبھی نہ کبھی جہنم سے نجات دلانے کا سبب بن جائے گا۔ پوری زندگی میں ایک مرتبہ اگر اس نے محبت کے ساتھ اللہ کا لفظ کہا: فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا ایک لفظ جو اس نے ایک مرتبہ کہا: کبھی نہ کبھی اس کو جہنم آگ سے بچاؤ کا سبب بن جائے گا۔ تو بھئی ہم بھی اللہ رب العزت سے محبت

کا اظہار کریں۔ نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، تلاوت کریں، نیکی کریں، جیسے اللہ والے بنتے ہیں، ہمیں ایسا طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہیے۔ فسق وفجور سے پرہیز کریں، گناہوں سے پرہیز کریں، تو یقیناً آخری وقت میں اللہ رب العزت کی طرف سے رحمت ہوگی۔ کیونکہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ((كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ)) جس حال میں تم زندگی گزارو گے تمہیں اس حال میں موت آئے گی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک بندہ نیکی پر زندگی گزارے اور آخری وقت میں کلمے سے محروم ہوجائے۔

ساتواں عمل......خوفِ خدا سے گناہ کو چھوڑنا

اللہ کے خوف کی وجہ سے گناہوں کو چھوڑ دینا۔

ایک تو ہوتا ہے کہ دنیا کی بدنامی کی وجہ سے گناہ کو چھوڑ دینا، کسی کی سزا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑ دینا۔ نہیں! اللہ رب العزت کے خوف کی بنا پر گناہ کو چھوڑنا۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے اگر کوئی نوجوان مرد ہو اور اس کو کوئی عورت گناہ کی طرف بلائے ((ذَاتَ مَنْصَبٍ وَّ الْجَمَالِ)) خوبصورت بھی ہو، اچھے گھرانے کی بھی ہو، اور وہ جواب میں کہہ دے:

إِنِّىْ أَخَافُ اللّٰهَ

''کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں''

تو فرمایا اس عمل پر اس کو اللہ قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب فرمادیں گے۔

اسی طرح کوئی مرد عورت کو گناہ کی طرف کھینچنے کی کوشش کرے اور وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتی ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے۔

امامِ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب فتوی:

اللہ کے ڈر سے گناہ کو چھوڑ دینا یہ بہت بڑا عمل ہے۔ چنانچہ کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ تھا۔ وقت کے ایک حاکم تھے، جیسے علاقے کے گورنر ہوتے ہیں اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ ذرا اچھے موڈ میں تھے اور بیوی کسی بات پر خفا تھی۔ اب ادھر سے ہاں ادھر سے نہ۔ ادھر سے اصرار اور ادھر سے انکار۔ یہ جتنا محبت کا اظہار کرتا، اس کو اتنی زہر چڑھتی حتی کہ اس نے جب بہت محبت کی بات کرنے کی کوشش کی، اس نے کہا: جہنمی دفعہ ہو پیچھے ہٹ۔ اب جب اس کی بیوی نے جہنمی کا لفظ کہہ دیا، اس کو غصہ آ گیا۔ غصے میں کہنے لگا: اگر میں جہنمی تو میری طرف سے تجھے تین طلاق۔ میں نے تجھے طلاق دے دی۔

اس وقت غصے میں تھے، رات تو گزر گئی۔ صبح کو جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو خاوند نے سوچا کہ مجھے طلاق تو نہیں دینی چاہیے تھی۔ اتنی پیاری بیوی تو مجھے نہیں ملنی، دل میں گھر کیا ہوا تھا، اس بیوی نے۔ اور بیوی نے بھی سوچا کہ مجھے اور کوئی لفظ کہہ دینا چاہیے تھا جہنمی کا لفظ تو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اب یہ ایک مسئلہ کہ اب طلاق واقع ہوئی یا نہیں ہوئی۔ علما سے رجوع کیا گیا۔ جس عالم سے مسئلہ پوچھتے ہیں وہ کہتا ہے کہ جی ہم تو اس کا جواب نہیں دے سکتے، کون بتائے کہ جہنمی ہے یا نہیں۔

تو یہ بات Talk of the town بن گئی۔ ہزاروں لوگوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ جی حاکمِ وقت کو مسئلہ پیش آ گیا اور کوئی اس کا جواب نہیں دے پا رہا۔ مسئلہ بھی عجیب تھا کہ کون کہے کہ تم جہنمی نہیں ہو یا تم جہنمی ہو یہ تو قیامت کے دن پتہ چلے گا۔

کون مقبول ہے کون مردود ہے
بے خبر کیا خبر تجھ کو کیا کون ہے؟
جب تلیں گے عمل سب کے میزان پر
تب کھلے گا کہ کھوٹا کھرا کون ہے

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا پتہ چلا، مسکرائے، فرمایا کہ ہاں میں اس کا جواب دے سکتا ہوں۔ لوگوں نے حاکمِ وقت کو بتایا، حاکمِ وقت نے بلوالیا کہ حضرت! آپ اگر اس کا جواب دے سکتے ہیں تو میرا مسئلہ حل فرمادیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں آپ سے علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں، تنہائی ہوگئی۔ انہوں نے بادشاہ سے پوچھا کہ مجھے آپ اپنی زندگی کا کوئی ایسا عمل بتائیں کہ آپ گناہ کرنے پر قدرت رکھتے ہوں پھر آپ نے اللہ کی رضا کے لیے، اللہ کے خوف کی وجہ سے اس گناہ کو چھوڑ دیا ہو۔ اس نے سوچ سوچ کر کہا کہ ہاں ایک مرتبہ میری زندگی میں ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہنے لگا کہ دن میں کسی وجہ سے اپنے دفتر کے کاموں کو چھوڑ کر میں اپنے بیڈروم میں جلدی آگیا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے محل میں کام کرنے والی ایک جوان العمر لڑکی وہ کمرے میں کچھ کام کر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس پر جب پہلی نظر پڑی تو اس قدر وہ خوبصورت تھی، نوجوان دوشیزہ تھی کہ میرے ذہن کے اندر برائی کا خیال آگیا اور اس خیال آنے کے بعد میں نے کونڈی لگا دی۔ میں حاکمِ وقت تھا، اگر میں اپنے اس ارادے کو پورا کر لیتا تو کس نے مجھے پوچھنا تھا؟ لیکن وہ لڑکی تقیہ نقیہ پاک صاف تھی، اس نے جب میرے بڑھتے قدم دیکھے تو پہچان گئی۔ اس نے مجھے دور سے کہا: یا ملك اتق الله او بادشاہ! اللہ سے ڈر۔ کہنے لگا کہ جب میں نے اللہ کا نام سنا تو میرے دل پر اللہ کا خوف غالب آگیا، میں نے کمرہ کھول کر اس کو کہا کہ چلی جا۔ میں چاہتا تو اس گناہ کو کر سکتا تھا، نفس

جذبات بھڑک اٹھے تھے، میرے اوپر شہوت غالب آ گئی تھی مگر اللہ کے ڈر سے میں نے اس گناہ کو چھوڑ دیا۔ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ایسا عمل ہوا تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ تمہاری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی، تم جہنمی نہیں ہو۔ اب جب فتویٰ دیا تو علما نے ان سے کہنا شروع کر دیا: آپ کون ہوتے ہیں جہنم اور جنت کے فیصلے کرنے والے؟ آپ نے یہ کہاں سے فتویٰ دے دیا؟ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے فتویٰ نہیں دیا، اللہ تعالیٰ نے فتویٰ دیا ہے۔ وہ کیسے جی؟ تو انہوں نے جواب میں قرآن مجید کی آیت پڑھ کر سنائی کہ اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔

﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾

''جو اپنے رب کے سامنے قیامت کے دن کھڑے ہونے سے ڈر گیا''

﴿وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾

''اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات میں پڑنے سے روک لیا''

﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ (النزعات:۴۰)

''پس ایسے شخص کا ٹھکانہ جنت ہے''

تو جب آدمی گناہ کو اللہ کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے پھر اللہ رب العزت اس کے لیے خاتمہ بالخیر ہونا آسان فرما دیتے ہیں۔

آٹھواں عمل......اذان کا جواب

آٹھواں عمل جس کی وجہ سے خاتمہ بالخیر آسانی سے ہو سکتا ہے، وہ ہے اذان سننا اور اس کے بعد اذان کی دعا پڑھنا۔ جیسے مسنون طریقہ ہے کہ مؤذن جو کہتا رہے وہی انسان بھی پڑھتا رہے اور آخر پر اذان کے بعد کی جو مسنون دعا ہے وہ مانگے۔ نبی علیہ

السلام نے فرمایا کہ جو یہ دعا مانگے گا (بخاری شریف کی روایت ہے)

((حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيمَةِ)) (البخاری، رقم: ۴۴۴۲)

اس کے لیے میری شفاعت لازم ہوگئی

جو یہ دعا مانگے گا، قیامت کے دن میں اس بندے کی شفاعت کروں گا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

چنانچہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اکثر اپنے بیانات میں یہ بات فرماتے تھے کہ جب کوئی بندہ کسی کام میں مصروف ہو اور اذان آجائے اور وہ اس کام کو روک لے۔ اذان سنے اور اذان کا جواب دے اور اس کے بعد جو اذان کی دعا ہے وہ دعا پڑھے۔ فرماتے تھے کہ میرا یہ تجربہ ہے کہ اللہ رب العزت اس عمل کی وجہ سے اس بندے کو آخری وقت کلمے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔

زبیدہ خاتون کی بخشش:

زبیدہ خاتون کا نام آپ نے سنا ہوگا اللہ کی نیک بندی تھی نہر زبیدہ بنوائی جس سے لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہوا، فوت ہوگئی، خواب میں کسی کو نظر آئی تو کسی نے پوچھا کہ زبیدہ کیا بنا؟ کہنے لگی کہ اللہ کا مجھ پر فضل ہوا، میری مغفرت ہوگئی۔ اس نے کہا کہ ہونی ہی تھی، تم نے اتنا بڑا کام کیا جس سے انسانوں کو فائدہ ہوا، حیوانوں کو فائدہ ہوا، اس کارِ خیر کی وجہ سے تمہاری مغفرت ہونی تھی۔ کہنے لگی نہیں نہیں! اس کی وجہ سے نہیں ہوئی، ایک ایسے عمل کی وجہ سے بخشش ہوئی جو مجھے یاد ہی نہیں تھا۔ اچھا! کون سا عمل کہنے لگی کہ ایک مرتبہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی، کھانا کھا رہی تھی میں نے لقمہ توڑا کہ سالن لگا کر منہ میں لے جاؤں، ابھی میں نے لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ ادھر سے مجھے اذان کی اللہ اکبر کی آواز آئی۔ کہنے لگی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر پہ دوپٹہ پورا نہیں تھا،

گھر میں جب عورتیں بیٹھی ہوتی ہیں تو کبھی اتر جاتا ہے، تو میرے سر پر دوپٹہ آدھا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ اللہ کے ادب کے خلاف ہے، میں نے لقمے کو نیچے رکھا، پھر دوپٹہ کو ٹھیک کیا، پھر لقمہ اٹھا کے کھایا۔ اللہ رب العزت نے میرے اس عمل کو پسند کیا کہ تم نے میرے نام کی تعظیم کی، اس عمل کے بدلے میں تمہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ کر دیتا ہوں۔ کوئی چھوٹی بات ہے!

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ چونکہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ میری شفاعت اس کو نصیب ہوگی لہٰذا

فَفِیْهِ اِشَارَةٌ اِلٰی بِشَارَةِ حُسْنِ خَاتِمَةٍ

کہ اس حدیث مبارکہ میں حسن خاتمہ کی بندے کو بشارت مل رہی ہے۔

نواں عمل......کلمہ کی کثرت

نواں عمل جس کی وجہ سے خاتمہ بالخیر میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کلمہ کثرت کے ساتھ پڑھا کریں۔ اس لیے کہ جو عمل کثرت کے ساتھ کرے گا موت کے وقت وہ عمل اس کو آسانی کے ساتھ کرنا نصیب ہو جائے گا۔ چنانچہ علما نے لکھا ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت کاروبار کی باتیں کرتے ہیں، کئی لوگ موت کے وقت گالیاں بکتے ہیں، جو کلمہ زندگی میں اکثر ان کی زبان پر رہتا ہے، آخری وقت میں وہی الفاظ نکلتے ہیں۔ تو بھئی جب کلمہ بار بار پڑھیں گے لا الٰہ کا ورد کریں گے تو یہ کلمہ زبان پر اتنا چڑھ جائے گا کہ بے دھیانی میں بھی انسان کلمہ پڑھتا رہے۔

چنانچہ ہمارے ایک تعلق والے دوست تھے، خوب کلمے کا ورد کرتے تھے، کسی وجہ

سے ان کو آپریشن تھیٹر میں جانا پڑا تو ڈاکٹر نے کہا کہ جب میں نے ان کو بے ہوش کیا تو یہ اس بے ہوشی کے وقت بھی کلمہ پڑھ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ جب آپریشن ہو جاتا ہے تو پھر آدھا پونا گھنٹہ لگتا ہے اس کو ہوش میں آنے میں، تو وہ آدھا پونا گھنٹہ کلمہ ہی اونچی آواز سے پڑھتے رہے۔ تو ہم اس کلمے کو اکثر پڑھیں چلتے ہوئے، پھرتے ہوئے، بیٹھے ہوئے، گاڑی میں سفر کرتے ہوئے۔

لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ

آرام سے پڑھ سکتے ہیں۔ آج اگر اپنے اختیار سے کلمہ پڑھیں گے تو موت کے قریب جا کر جب اختیار چھننے والا ہو گا تو اس وقت بھی اللہ پڑھنے کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

مرنے والے کو کلمہ کی تلقین:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''مرنے والے کو کلمے کی تلقین کرو''

کیا مطلب؟ یہ مطلب نہیں ہے کہ مرنے والا مر رہا ہو ہم اس کو کہیں کہ کلمہ پڑھو۔ نہیں، فرمایا: تلقین کا مطلب تذکیر ہے۔ اس کے سامنے بیٹھ کر تم اگر اونچی آواز میں کلمہ پڑھ لو گے تو اس کو خود بخود بھولا سبق یاد آ جائے گا۔ اللہ کرے کہ آخری وقت میں کوئی اللہ والا ہمارے بھی پاس ہو۔

اچھا کلمہ کی تلقین کرنے کی بات بھی ذرا سمجھ لیجیے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے اوپر والوں نے اس کے لیے مصیبت بنا رکھی ہوتی ہے۔ بیوی آتی ہے، کہتی ہے: پہچانا میں کون ہوں؟ کبھی بیٹے کو آگے کر دیتی ہے، سن رہے ہو، یہ کون تم سے بات کر رہا ہے؟ یہ زیادتی ہے اس بندے کے ساتھ، اس کی جمعیت کو

پریشان کرتے ہیں۔ ساری عمر اس نے آپ کو پہچانا، اب اس وقت تو اس کو خدا کو پہچاننے دو۔ سن رہے ہو! میں بول رہی ہوں، خدا کی بندی! یہ وقت ہے کہ تم خود بھی خدا سے دعا مانگو اور اس کے سامنے اونچا کلمہ پڑھو تا کہ اس کو کلمہ یاد آ جائے۔

ایک بات اور میں عرض کر دوں کہ آخری وقت میں جو مریضوں کو ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے یہ بھی ایک بڑی مصیبت ہے۔ یہ اللہ کے بندے ان کو بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کو چاہیے کہ اگر محسوس کرے کہ موت کا وقت قریب ہے تو بے ہوشی کا ٹیکہ مت لگائے۔ کیونکہ وہ بے ہوش ہوگا تو کلمہ بھی نہیں پڑھ سکے گا بیچارہ۔ یہ کوئی کافر تھوڑا ہے، یہ تو مومن ہے۔ ہمارے ہاں زندگی کا **Concept** (تصور) مختلف ہے۔ کافروں کے ہاں **Concept** ہے کہ مریض کو تکلیف نہ ہو، بے ہوش کر دو مر جائے گا۔ مگر اس طرح تو ہم نے تو اس کے ساتھ ظلم کر دیا، اس کی آخرت کا نقصان کر دیا کہ وہ کلمہ پڑھے بغیر چلا گیا۔ آخری وقت میں اور دوائیاں بے شک دیتے رہو، بے ہوشی کا ٹیکہ کبھی نہ لگاؤ۔ ہوش میں رہے تا کہ اللہ اس کو کلمہ پڑھنے کی توفیق عطا فرما دے۔ اور اگر آپ اس کی تیمارداری کر رہے ہیں تو آپ بھی ڈاکٹر صاحب کو سمجھائیں کہ اور ساری دوائیاں آپ دیں بے ہوشی کا ٹیکہ نہ لگائیں۔

تو اوپر والوں کو چاہیے کہ تلقین کریں۔ تلقین کا مطلب کہ اونچی آواز سے کلمہ پڑھیں تا کہ اس کو بھولا سبق یاد آ جائے۔

حضرت ابوذرعہ رضی اللہ عنہ کا آخری وقت:

ابوذرعہ رضی اللہ عنہ ایک محدث گزرے ہیں، کہتے ہیں کہ جب ان کا آخری وقت آیا تو ان کے شاگرد تھے، وہ بڑے حیران کہ ہم حضرت کو کلمہ کی تلقین کیسے کریں؟ تو شاگردوں نے کہا کہ اچھا جس حدیث پاک میں یہ ہے، ہم استاد کے سامنے وہ

حدیث پاک پڑھتے ہیں تو خود بخود تلقین ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے حدیث پاک پڑھنی شروع کر دی۔ عن فلاں عن فلاں جب انہوں نے دو تین راویوں کے نام پڑھے تو ان کو بھی یاد آ گیا کہ یہ فلاں حدیث پڑھ رہے ہیں۔ تو ان سے آگے حضرت نے خود پڑھنی شروع کر دی۔ پڑھتے پڑھتے جب انہوں نے کہا من کان آخر کلامہ جس کی زندگی کا آخری کلام ہو لا الہ الا اللہ یہ الفاظ نکلے، ان کی روح یہیں پر قبض ہو گئی۔ دخل الجنۃ عملی طور پر جنت میں داخل ہو گئے۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ آخری وقت میں اللہ تعالیٰ ان کو ایسی موت عطا فرما دیتے ہیں۔

دسواں عمل......خاتمہ بالخیر کی دعا

دسواں عمل کہ جس کی وجہ سے آخری وقت میں بندے کو کلمے کی توفیق ہو گی یہ کہ بندہ اس کی دعا مانگے۔

حدیث شریف میں ایک دعا آئی ہے:

((اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِی الْمَوْتِ وَ فِیْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))

(مسند ابی الجعد، رقم:۱۷۹۶)

صبح شام اس کو کئی مرتبہ مانگنا سنت عمل بھی ہے۔

اور اللہ سے یہ دعا مانگیں:

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

''اے اللہ! اپنی رحمت سے میری مدد فرما دیجیے''

قرآن مجید کی ایک دعا ہے انسان اس کو اپنی دعاؤں کا ایک حصہ بنا لے روز مانگے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾

(آل عمران:۸)

''اے اللہ! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ فرما دینا اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما دیجیے۔''

اب یہاں پر ھَبْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ھَبْ کا مطلب ہوتا ہے کسی کو تحفہ دینا، ہبہ کر دینا۔ اس ھَــبْ سے کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اللہ ہمیں اپنی رحمت ہبہ کر دیجیے بات سمجھنے والی ہے۔ جنت ہمارے عملوں سے کبھی نہیں مل سکتی، کیوں؟ عمل تو ہیں محدود اور فانی اور جنت باقی رہنے والی ہے۔ تو فانی عملوں پر باقی رہنے والی جنت کیسے ملے؟ ہمارے عمل اس کو الٹی کے ہو بھی نہیں سکتے کہ جنت کی قیمت بن سکیں۔

جب اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے فرمادیا:

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ)) (الترغیب والترھیب، رقم:۳۶۲۶)

کہ اللہ جیسے تیری عبادت کا حق تھا ہم حق ادا نہیں کر سکے ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں بھئی کہ ہم کہیں کہ ہمارے عمل ایسے ہیں کہ ہمیں جنت لازمی ملے گی اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ ان عملوں کے بدلے جنت عطا فرمادے بلکہ فرمایا:

﴿هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾

اللہ آپ ہمیں ہبہ فرما دیجیے، اپنی طرف سے انعام عطا کر دیجیے۔

﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (ال عمران:۸)

اے اللہ! آپ بہت بڑے داتا ہیں۔ ہمیں اگر جنت ملنی ہے تو آپ کے کرم سے ملنی ہے، آپ کے فضل سے ملنی ہے تو یہ ذہن میں رکھ لیجیے۔

حالت ہماری ایسی ہے کہ چھوٹے بچے کو جو ابھی چلنا سیکھ رہا ہو باپ اپنی طرف بلاتا ہے تو باپ کو پتہ ہوتا ہے کہ چل کر نہیں آسکتا، باپ پھر بھی کہتا ہے کہ آؤ! لیکن نظر

رکھتا ہے۔ بچہ تھوڑا ڈولتا ہے، قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب گرنے لگتا ہے تو گرنے سے پہلے اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا کرتا ہے۔ ہمارا بھی وہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ میرے بندو! عمل کرو! شیطان تمہیں بہکائے گا، بھٹکنا نہیں، میری طرف آنا ہے۔ اب ہم کبھی گر پڑتے ہیں، کبھی توبہ کر لی، کبھی نیکی کر لی، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ آ تو ہماری طرف ہی رہا ہے نا۔ چل تو رہا ہے ہماری طرف، جب بندہ اپنی طرف سے کوشش کرتا ہے، اللہ کے حضور آنے کی تو پھر اللہ تعالیٰ آخری وقت میں اس کا برا خاتمہ نہیں ہونے دیتے۔ اس بندے کو اٹھا کے اپنی رحمت میں چھپا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان کی ان مبارک گھڑیوں میں یہ نعمت عطا فرماوے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے یہ بات بتلائی کہ یہ دعا مانگو!

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ)) (ابی داود، رقم: ۶۷۲)

''اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور جہنم سے پناہ مانگتا ہوں''

ہم بقیہ رمضان کے ایام میں یہ دعا مانگیں۔ یا اللہ! اسلام پر زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرماوے اور آخری وقت میں ایمان کی حالت میں موت عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ